لکھنؤ
تعمیر حیات
پندرہ روزہ

آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس اس سال ایک ایسے ادارے اور تعلیمی مرکز میں

منعقد ہو رہی ہے جس کے متعدد بانیوں اور فضلاء نے اسلامی مباحث و تحقیقات کے میدان میں اپنے بحث و تحقیق، مطالعہ و محنت، توازن دماغی، اصابت رائے اور نظر کی گہرائی و گیرائی کے تابناک نقوش چھوڑے ہیں، اردو زبان و ادب میں، علمی تحقیق و جستجو میں ان کو اولیت و پیش قدمی کا شرف حاصل ہے

"یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ متعدد اسلامی ملکوں کے برخلاف ہندوستان کے علماء علم و تحقیق کے قافلے سے پچھڑنے نہیں پائے اور انہوں نے اپنے ملک کی زبان و ادب سے ناطہ نہیں توڑا۔"

"اس کی سخت ضرورت ہے کہ ہماری علمی و ذہنی توانائیوں کا بڑا حصہ انگریزی میں اسلامی لٹریچر پیدا کرنے پر صرف ہو۔"

آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے اجلاس ہشتم منعقدہ دار العلوم ندوۃ العلماء (۶، ۷، ۸ر اکتوبر ۱۹۸۴ء) میں

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا خطبۂ صدارت

فضلائے گرامی! یہ حسن اتفاق ہے کہ اسلامک اسٹڈیز کانفرنس اس سال ایک ایسے ادارے اور تعلیمی مرکز میں منعقد ہو رہی ہے جس کے متعدد بانیوں اور فضلاء نے اسلامی مباحث و تحقیقات کے میدان میں اپنے بحث و تحقیق، مطالعہ و محنت، توازن دماغی، اصابت رائے اور نظر کی گہرائی و گیرائی کے تابناک نقوش چھوڑے ہیں، اور جہاں تک اردو زبان اور اس تحتی براعظم میں علمی تحقیق و جستجو کا تعلق ہے، ان کو ایک طرح سے اولیت و پیش قدمی حاصل ہے، انہوں نے اس کے لئے وہ زبان و پیرایۂ بیان اختیار کیا جو ان علمی مباحث کے مزاج سے پوری مطابقت رکھتا ہے اور اس میں صحیح تناسب کے ساتھ ادب و انشاء کی وہ چاشنی بھی موجود ہے، جس کے بغیر اس نسل کے ان نوجوانوں کا جن کا نشو و نما ہندوستان کے گذشتہ ادب نواز و ادب پرور ماحول میں ہوا تھا ان خشک علمی و تاریخی مباحث کے پڑھنے پر آمادہ ہونا دشوار تھا، نیز ان کی نگارشات نے اس طبقے کا اپنے عقائد و دینی مسلّمات، اپنی تہذیب و تمدن، اپنی تاریخ اور اپنے زبان و ادب پر اعتماد بحال کیا اور اس میں خود داری و خود اعتمادی پیدا کی جو ۱۸۵۷ء کی شکست و ریخت اور مغربی تہذیب و تعلیم کے یلغار سے مایوسی و احساس کہتری کا شکار تھا، عربی و فارسی زبانوں پر عبور رکھنے، علوم اسلامیہ کی منظم و تفصیلی تعلیم حاصل کرنے اور ان مباحث و تحقیقات کے قدیم و مستند ماخذ پر براہ راست نظر رکھنے اور ان سے استفادہ کر سکنے کی صلاحیت کی بنا پر ان کی تحریروں میں "اصالت" ([illegible]) اور پختگی پائی جاتی ہے اور وہ ان ناہمواریوں اور غلط فہمیوں سے بڑی حد تک پاک تھیں جو بالواسطہ مطالعے و ترجمے اور سکنڈ ہینڈ معلومات کا قدرتی نتیجہ ہوتی ہیں، اور جن سے مغرب کے بہت سے نامور مستشرقین اور ان کے تلامذہ اور خوشہ چیں محفوظ نہیں رہ سکے۔

اگر زبان کوئی حجاب اور عیب نہیں اور کسی بحث و تحقیق یا تصنیف و تالیف کی اصل قدر و قیمت (Merit) مواد و مضامین، مستند معلومات اپنی تحقیق کو ثابت کرنے کے لئے قوی علمی دلائل، صحیح تحلیل و تجزیہ، داخلی شواہد اور دستاویزی ثبوت ہے تو پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ فارسی شاعری کی تاریخ اور شعراء ایران کے تذکرے اور نقد سخن میں مولانا شبلی نعمانی کی مایہ ناز کتاب "شعر العجم"، جزیہ اور ذمّیین کے حقوق کے بحث پر ان کے فاضلانہ مضامین "الجزیۃ فی الاسلام" اور "حقوق الذمیین" ایک مشہور عوام و زبان زد خلائق الزام کی تردید اور اس کی تاریخی حقیقت کے بے نقاب کرنے کے سلسلے میں ان کی دو محققانہ کتابیں "کتب خانہ اسکندریہ" اور "اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر"، تاریخ نگاری اور علمی تنقید کا نمونہ کہی جا سکتی ہیں، اسی طرح ان کے ایک معاصر و رفیق کار مولانا حکیم سید عبد الحی سابق ناظم ندوۃ العلماء کی کتاب "گل رعنا" اردو شعراء کے تذکرے میں اور "یاد ایام"، صوبہ گجرات کی علمی، تمدنی، تعمیری، رفاہی اور اخلاقی و روحانی ترقی و شائستگی اور وہاں کے سلاطین و وزراء، اور علماء و مشائخ کے تعارف میں ایک مثالی تذکرے کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے طرز و اسلوب پر ہندوستان کے تمام صوبوں اور ریاستوں کی تاریخ لکھنی چاہیے تھی اسی طرح اول الذکر کتاب "گل رعنا" میں انہوں نے اردو زبان و شاعری کی تاریخ و ارتقاء کے سلسلے میں بعض نئی تحقیقات و نظریات پیش کئے ہیں اور اردو کے سب سے مشہور و مقبول تذکرے "آب حیات" کی جس کو ادبی حلقوں میں ماورائے تنقید سمجھ لیا گیا تھا، بہت سی تاریخی غلطیوں اور فروگذاشتوں کی نشاندہی اور متعدد ناہمواریوں اور ناانصافیوں کی بھی وضاحت کی گئی ہے جن کے سلسلے میں مصنف کتاب کا سحر نگار اور جادو طراز قلم حقیقت سے دور جا پڑا تھا۔

دوسرے دور میں مولانا شبلی کے مایۂ ناز شاگرد اور اس درسگاہ کے (جہاں اس وقت آپ جمع ہیں) نامور فاضل مولانا سید سلیمان ندوی کی تصنیفات "عرب و ہند کے تعلقات"، "عربوں کی جہاز رانی" اور "خیام"، بحث و تحقیق، وسیع مطالعہ اسلامی کتب خانے

(بقیہ صفحہ پر)

Regd No. LW/NP 58
Phone : [illegible]
TAMEER-E-HAYAT
Fortnightly
NADWATUL-ULAMA LUCKNOW-226007 (INDIA)
SARFRAZ

کتب خانہ

دار العلوم ندوۃ العلماء کا کتب خانہ ہندوستان کے گنے چنے کتب خانوں میں سے ایک معروف و مشہور کتب خانہ سمجھا جاتا ہے، جہاں علوم سے دلچسپی رکھنے والے بیرونی ممالک سے بھی لوگ استفادہ کرتے ہیں، یہ کتب خانہ دار العلوم کے وسیع و عریض ہال میں عرصہ سے قائم ہے اس کے لئے علیحدہ عمارت کی ضرورت کا عرصہ سے احساس ہوتا رہا ہے اس کا نقشہ بن گیا ہے اور اب اس عمارت کی تعمیر کا آغاز ہونا ہے۔ الحمد للہ اس مد کی کچھ رقم محفوظ ہے لیکن مزید کی اس میں ضرورت ہے۔

دار تحفیظ القرآن الکریم

دار العلوم ندوۃ العلماء نے جب دار العلوم میں شعبہ حفظ کا افتتاح کیا تھا اسی وقت سے یہ ارادہ بھی کر لیا تھا کہ اس شعبہ کے لئے علیحدہ عمارت ہو گی جس میں تعلیم کے ساتھ رہائش کا بھی نظم ہوگا۔ اس عمارت کا بھی نقشہ منظور ہو گیا ہے اسکی تعمیر کا بھی آغاز ہونا ہے۔

پریس اور دفاتر کی عمارت

پریس اور مختلف دفاتر کے لئے علیحدہ ایک عمارت بھی عرصہ سے زیر تجویز رہی ہے تاکہ دار العلوم کی عمارت صرف تعلیمی اغراض ہی میں استعمال ہو، سائے درجات اسی میں رہیں جگہ کی تنگی کی وجہ سے جو انتشار کبھی کبھی ہو جاتا ہے وہ ختم ہو جائے چنانچہ اس عمارت کا بھی نقشہ منظور ہو گیا ہے اور اس عمارت کی تعمیر بھی ہونا ہے۔

ان گذارشات کے بعد آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دار العلوم کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون و اعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائیدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔ آپ میں سے جو لوگ ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن تعلیمی میں شریک تھے ان کو یاد ہوگا کہ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے غیر ملکی معزز عرب مہمانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:-

"یہ سونے کی چڑیاں سب اڑ جائیں گی ہم اور آپ یہاں رہیں گے، آپ یہ نہ سمجھیں کہ اب آپ کو چھٹی مل گئی ہم آپ کو چھوڑنے والے نہیں، ہمارے سفیر آپ کے گھروں پر جائیں گے آپ کے چار آنے آٹھ آنے ہم کو عزیز ہیں۔ یہ جو کچھ دیں گے وہ اس دولت کا ہزارواں حصہ ہوگا جو خدا نے ان کو دیا ہے اور جو آپ دیں گے وہ آپ کے گاڑھے پسینہ کی کمائی ہوگی۔"

خدا کا شکر ہے کہ ہم ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں، ہمارے نزدیک مالیات، بجٹ اور عظیم الشان عمارتوں سے زیادہ وہ مقصد عزیز ہے جس کے لئے یہ دار العلوم قائم کیا گیا ہے، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی موثر اور صحیح ترجمانی دین و دنیا کی جامعیت اور علم و روحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنہ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور علوم اسلامیہ کی برتری و امتیاز کا اعلان و اظہار دین حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت، مسئلہ کی اس قدر تشریح اور وضاحت کے بعد ہمیں اب مزید کچھ کہنے کی حاجت نہیں، ہم اللہ کا نام لے کر ان میں سے متعدد اہم کام جن میں سرفہرست "دار تحفیظ القرآن الکریم" اور ایک عظیم الشان لائبریری کا قیام ہے (جہاں انشاء اللہ مطالعہ، بحث و تحقیق اور علمی استفادہ کا اعلیٰ انتظام ہوگا) آغاز کر رہے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں سے خواہ وہ اس طویل و عریض ملک کے کسی علاقے کے ہوں ہماری مکرر درخواست ہے کہ وہ اس کام کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کو اپنا ہی کام سمجھیں۔ ہمیں یقین اور اللہ تعالیٰ کی ذات عالی پر پورا بھروسہ ہے کہ انشاء اللہ مولانا مدظلہ کی بیش قیمت و بابرکت رہنمائی و نظامت میں اگر احباب و مخلصین نے پوری دلچسپی لی تو ہمارا یہ پیغام نہ صرف ملک کے گوشہ گوشہ بلکہ عالم اسلام کے کونے کونے میں پہونچے گا۔

وما ذلک علی اللہ بعزیز

(مولانا) عبد السلام قدوائی ندوی
معتمد تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء

(مولانا) معین اللہ ندوی
نائب ناظم ندوۃ العلماء

(مولانا) محب اللہ لاری ندوی
مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء

(جناب) مصباح الدین نقوی
معتمد مال ندوۃ العلماء

ضروری اعلان!

"تعمیر حیات" کا رجسٹر نیا کیا جا رہا ہے، اب تمام خریداروں کے نمبر بدل جائیں گے۔ براہ کرم چٹ پر چھپا ہوا نیا نمبر نوٹ فرمالیں۔ تمام خریدار حضرات اپنا پن کوڈ نمبر تحریر فرمائیں۔

(منیجر)

چندہ سالانہ

اندرون ملک: بارہ روپے

بیرون ملک: بحری ڈاک جملہ ممالک ڈھائی پونڈ

ہوائی ڈاک

بیرون ملک: مشرق وسطی سعودی عربیہ ایران و خلیج پاکستان،

برما و لنکا سے چار پونڈ

بیرون ملک: ممالک افریقہ سے ساڑھے پانچ پونڈ

بیرون ملک: ممالک یورپ سے سات پونڈ

لکھنؤ

تعمیر حیات

پندرہ روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد ۱۵ | ۲۵ر ستمبر و ۱۰ر اکتوبر ۱۹۷۶ء — ۲۱ر شوال و ۶ر ذی قعدہ ۱۳۹۶ھ | شمارہ ۲۲ و ۲۳

آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس

اسحٰق جلیس ندوی

آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا قیام ۱۹۵۸ء میں اس موقع پر عمل میں آیا جب دسویں صدی عیسوی کے مشہور عرب مؤرخ اور سیاح المسعودی کی ہزار سالہ یادگار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں منائی جارہی تھی — اس یادگاری جشن میں ہندوستان، عالم اسلام اور مغربی ممالک کے مشہور علماء اور اسکالرز جمع تھے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ مطالعات اسلامی (اسلامک اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ) بھی ۱۹۵۱ء سے شروع ہوچکا تھا، ڈاکٹر مقبول احمد، پروفیسر ڈاکٹر عبد العلیم اور ان کے رفقاء کی کوششوں سے اسلامک اسٹڈیز کا پہلا اجلاس ڈاکٹر نظام الدین مرحوم (عثمانیہ یونیورسٹی) کی صدارت میں المسعودی کے جشن کے زمانہ میں علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ اور یہ طے ہوا کہ کانفرنس کا مستقل ہیڈ کوارٹر علی گڑھ ہی میں رہے تاکہ تنظیمی امور میں آسانی رہے۔

کانفرنس کا دوسرا اور تیسرا اجلاس ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۲ء میں بالترتیب ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی (کلکتہ یونیورسٹی) اور ڈاکٹر عبد المعید خاں (عثمانیہ یونیورسٹی) کی صدارت میں مسلم یونیورسٹی ہی میں منعقد ہوا، چوتھا اجلاس عثمانیہ یونیورسٹی کی دعوت پر حیدرآباد میں ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر سید محمد حسین نینار مرحوم (مدراس یونیورسٹی) نے فرمائی، یہیں سے اس روایت کی بنیاد پڑی کہ کانفرنس کے اجلاس ملک کے مختلف مقامات پر ہوں، پانچواں اجلاس ۱۹۶۷ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں ہوا، جس کی صدارت مشہور محقق مولانا امتیاز علی خان عرشی نے کی، پروفیسر ہمایوں کبیر نے اس کا افتتاح فرمایا، ۶۶ مندوبین شریک ہوئے۔ چھٹا اجلاس ۱۹۶۹ء میں دار المصنفین اعظم گڑھ میں ہوا جس کی صدارت حکیم عبد الحمید صاحب نے کی، افتتاح مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے فرمایا۔ ساتواں اجلاس ۱۹۷۲ء میں دار العلوم تاج المساجد بھوپال میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ بھوپال کے اجلاس میں یہ بات طے ہوچکی تھی کہ اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا آٹھواں اجلاس دار العلوم ندوۃ العلماء میں ۱۹۷۵ء میں منعقد ہوگا، لیکن ندوۃ العلماء کے ۸۵ سالہ جشن کی تقریبات اور مشغول پروگرام میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ اس کے ساتھ اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا اجلاس منعقد کیا جاتا، لہٰذا اسے مؤخر کردیا گیا۔ اور اب ۶، ۷، ۸ر اکتوبر ۱۹۷۶ء سے دار العلوم ندوۃ العلماء میں آٹھواں اجلاس منعقد ہو رہا ہے۔

اسلامک اسٹڈیز کانفرنس خالص علمی ادارہ ہے اس کا اہم مقصد اسلامی تہذیب و تمدن، اسلامی علوم و فنون، اسلامی تاریخ، اور خاص طور پر علوم اسلامیہ پر بحث و تحقیق ہے، اس لئے اس میں زیادہ تر علمی مقالات اور مضامین پڑھے جاتے ہیں، جن پر بحث و مباحثہ ہوتا ہے۔ ہر کانفرنس میں مندوبین کی تعداد ستر، اسی تک ہوتی ہے، اور تقریباً اتنے ہی مقالات پڑھے جاتے ہیں۔ کانفرنس کے پاس فنڈ کی کمی کی وجہ سے ان مقالات کا مجموعہ شائع نہیں ہوتا۔ اگر اس طرح کا مجموعہ شائع ہوا کرے تو اس کا دائرۂ افادہ و استفادہ خاصا وسیع ہوسکتا ہے۔

اس کانفرنس کا اہم مقصد انسانی تہذیب و تمدن کے ان تمام پہلوؤں کا مطالعہ اور تحقیق و اشاعت ہے جن کی بنیاد اسلام پر ہے، کانفرنس کے آئندہ پروگرام میں یہ بھی شامل ہے کہ ملک کے مختلف مقامات پر اس کے اجلاس منعقد ہوں، علمی نمائش، سمپوزیم اور کانفرنس کی روداد شائع کی جائے، اسلامی تاریخ و تہذیب و تمدن سے متعلق علمی مصادر و مآخذ کی فہرستیں شائع کیجائیں جو علماء اور اسکالرز اسلامی موضوعات پر تحقیق کرنا چاہتے ہوں ان کی مدد کی جائے اور پورے ملک کے علماء اور علمی اداروں میں رابطہ اور تعاون و اشتراک پیدا کیا جائے۔

اسلامک اسٹڈیز کانفرنس نے جدید تعلیم کی دانشگاہوں اور دینی مدارس کے فضلاء، علماء اور اسکالرز کے باہم ملنے اور تبادلۂ افکار و خیالات کا اچھا موقع فراہم کیا ہے۔ کانفرنس کے ساتویں اجلاس منعقدہ تاج المساجد بھوپال کی افتتاحی تقریر میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے فرمایا تھا کہ جدید اور قدیم کے بُعد کو دور کرنے میں یہ کانفرنس کامیاب کوشش کررہی ہے، اس علمی مجلس مذاکرہ کے انعقاد نے ہماری ایک قدیم روایت کو زندہ کیا ہے، مسجد ازہر اور جامع زیتونہ کے ذریعہ جو علمی خدمات انجام پائی ہیں آج ان کی یاد تازہ ہوگئی۔ اس مؤقر علمی مجلس کی خالص تحقیقی و علمی روح نے یہ ثابت کردیا ہے کہ جدید اور قدیم کی تفریق مٹنا چاہئے، مجھے خوشی ہے کہ یہ دونوں طبقے آج مل گئے ہیں اور امید ہے کہ یہ دونوں اسی طرح مل جل کر دین، علم اور ملت کی خدمت کرتے رہیں گے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء میں ۶تا۸ر اکتوبر سے منعقد ہونے والے اجلاس میں ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور دینی تعلیم کے مراکز کے علماء اور دانشور شریک ہورہے ہیں، افتتاحی اجلاس ۶ر اکتوبر ۱۹۷۶ء کو دار العلوم کے عباسیہ ہال میں منعقد ہوگا جس میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے خطبۂ صدارت اور مولانا قاری محمد طیب صاحب کی افتتاحی تقریر ہوگی۔ سہ روزہ اجلاس میں مقالے پڑھے جائیں گے اور نئی میقات کے لئے عہدہ داران کا انتخاب ہوگا۔ اس کانفرنس کے سلسلے میں جو مجلس استقبالیہ تشکیل دی گئی ہے اس کے صدر مولانا عبد السلام قدوائی ندوی اور سکریٹری مولانا محمد رابع ندوی ہیں۔

لیبیا میں اسلام اور مسلمانوں کا حال زار

لیبیا کے حالات بڑے مایوس کن بلکہ ناقابل برداشت سے ہوگئے ہیں، قذافی جو اسلام کے نام پر شروع میں مقبولیت حاصل کرتا رہا اس کے "زبایہ" نے پکے کچے اور چھپے ہوئے اخوان پر بہت ظلم توڑے، اس سال اس نے سنت نبوی کے خلاف بہت سخت مہم چلا رکھی ہے، اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے نصاب سے حدیث نبوی کو نکالا جارہا ہے، حدیث کے بے بہا ذخیرہ کو کتب صفراء کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اسسال عید میلاد النبی کے موقع پر اس نے لی۔ وی میں سنت نبوی پر کھلا حملہ کیا، لوگ بھی کچھ برہم ہوئے مگر سہمے ہوئے ہیں اور غیرت دینی ناپید ہے بہت اماموں کو یا علیحدہ کردیا گیا ہے یا جیل میں بند کردیا گیا ہے۔ ملک ایک مکمل پولیس اسٹیٹ بنا ہوا ہے، شاگرد استاد کا اور دوست، دوست کا جاسوس بنا ہوا ہے، روس کا زبردست اثر ہے، اس طریقہ کا سوشلزم بزور نافذ کیا جارہا ہے، لوگوں کی املاک پر قبضہ کرلیا گیا ہے۔

حدیث نبوی کے خلاف کرنل قذافی کی چلائی ہوئی مہم کا نوٹس عالم اسلام کے علماء اور دانشوروں نے لیا ہے۔ مصر کے مشہور عالم الشیخ حسن الباقوری نے مصر کے روزنامہ "الاخبار" میں کرنل قذافی کے خطرناک رجحانات پر بڑے مدلل انداز میں تنقید کی ہے۔ کویت کے مشہور دینی ہفت روزہ "المجتمع" میں بھی اس سلسلے میں مضامین شائع ہوئے ہیں۔ زیر نظر شمارہ میں ہم اس موضوع پر ایک مؤثر مضمون شائع کررہے ہیں، ہندوستان کے اہل علم کو کرنل قذافی کے سلسلے میں اپنے حسن ظن اور اس کے افکار و خیالات اور "کتاب سبز" کی اشاعت و تبلیغ کی کوشش کو دین کی کسوٹی پر پرکھنا چاہئے۔!!

تعلیم القرآن

از: مولانا محمد اویس ندوی مرحوم

قرض حسنہ

وَاَقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا — اور خدا کو قرض حسنہ دو۔

دنیا میں ہمارے ساتھ کوئی احسان کرتا ہے، ہم بھی اس کے ساتھ اسی قسم کی بھلائی کردیتے ہیں، لیکن اللہ نے ہمارے ساتھ جو بھلائیاں کی ہیں، اس کا بدلہ ہم اللہ کو تو دے نہیں سکتے ہیں، اس لئے وہی سلوک ہم کو اللہ کے بندوں کے ساتھ کرنا چاہئے، اسی کا نام خدا کو قرض دینا ہے ظاہر ہے کہ اللہ ہمارا محتاج نہیں ہے کہ اس کو قرض دیا جائے خدا کو قرض دینا یہی ہے کہ اس کے ضرورتمند بندوں کو اور ضرورت والے کاموں میں مدد دی جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "قیامت کے دن خدا کہے گا، اے آدم کے بیٹے! میں بیمار پڑا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، بندہ کہے گا اے میرے پروردگار تو، تو جہاں کا پروردگار ہے میں تیری بیمار پرسی کیسے کرتا، فرمائے گا کیا تجھے خبر نہ ہوئی میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کو نہ پوچھا اگر پوچھتا تو تو مجھے اس کے پاس پاتا، پھر خدا فرمائے گا اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے مجھے نہیں کھلایا، بندہ کہے گا اے میرے پروردگار تو تو سارے جہان کا رب ہے میں تجھے کیسے کھلاتا، فرمائے گا تجھ کو معلوم نہ ہوا کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے اس کو نہیں کھلایا، اگر تو اس کو کھلاتا تو اس کا بدلہ آج میرے پاس پاتا۔ اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو تو نے مجھے پانی نہیں پلایا بندہ کہے گا اے میرے پروردگار تو تو سارے عالم کا پروردگار ہے میں تجھے کیسے پانی پلاتا؟ فرمائے گا میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا تو نے اس کو نہیں پلایا اگر تو اس کو پلاتا تو آج تو اس کو میرے پاس پاتا۔

قرض

وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ۔ (بقرہ)

اور اگر (جس پر قرض ہے) اس کا ہاتھ تنگ ہے تو اس کو مہلت دو جب تک اس کا ہاتھ کشادہ ہو، اور اگر معاف کردو، تو تمہارے لئے اچھا ہے۔

ضرورت پر لوگ ایک دوسرے سے اُدھار لیتے رہتے ہیں، لیکن چاہیے کہ آدمی قرض کو جس قدر جلد ہوسکے ادا کردے، حدیث میں ہے کہ تم میں اچھے وہ لوگ ہیں جو قرض ادا کرنے میں اچھے ہیں۔ حضرت زبیرؓ جب جنگ جمل میں شریک ہوئے تو اپنے بیٹے کو بلاکر کہا کہ میرا خیال ہے کہ میں بھی آج مظلوماً شہید ہوں گا، مجھ کو سب سے زیادہ اپنے قرض کی فکر ہے، ہماری جائداد بیچ کر سب سے پہلے قرض ادا کرنا اور اگر مجبور ہوجانا تو ہمارے خدا سے مدد چاہنا۔

صحابہ کرام قرآن کے حکم کی وجہ سے قرضداروں کو مہلت دیتے تھے، ایک شخص پر حضرت قتادہؓ کا قرض آتا تھا، وہ تقاضے کو آتے تھے تو یہ گھر میں چھپ جاتے تھے، ایک دن آئے اور ان کے بچہ سے پوچھا کہ وہ کہاں ہیں؟ اس نے کہا گھر میں کھانا کھا رہے ہیں! بلاکر پوچھا کیوں چھپ گئے تھے؟ بولا سخت تنگ دست ہوں، میرے پاس کچھ نہیں ہے، حضرت قتادہؓ کی آنکھ میں آنسو آگئے اور کہا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے قرضدار کو مہلت دیتا ہے یا قرض معاف کردیتا ہے وہ قیامت کے دن عرش کے سایہ میں ہوگا۔

صحابہ نہ صرف یہ کہ مہلت دیتے تھے۔ بلکہ قرض معاف کردیا کرتے تھے، ایک شخص پر حضرت ابو الیسرؓ کا قرض تھا، یہ آدمی بہت تنگدست تھا، حضرت ابو الیسرؓ نے کہا جاؤ تمہارا قرض معاف ہے۔

ایک دفعہ ایک جنازہ آیا، جس پر تین دینار قرض تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھنے سے انکار فرمایا، تو حضرت ابو قتادہ انصاری نے کہا یا رسول اللہؐ میں اس کا قرض ادا کردوں گا، اب آپ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

محسنِ انسانیت نے فرمایا

صفات قدسیہ

تعارف ربانی — حدیث قدسی

صحیح بخاری میں بروایت حضرت عطاء رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسی حدیث مروی ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر اخلاق کریمہ کے لئے جامع ہے اور ان میں کچھ صفات عالیہ قرآن کریم میں بھی مذکور ہیں چنانچہ حدیث قدسی میں ہے:۔

۱۔ یا ایھا النبی انا ارسلناک شاھدا و مبشرا و نذیرا و حرزا للامیین

(ترجمہ) اے نبی بیشک ہم نے آپ کو حق پر گواہ بناکر بھیجا۔ فرماں برداروں کو بشارت دینے والا اور گمراہوں کو عذاب سے ڈرانے والا اور امیوں کے لئے پناہ دینے والا بنایا ہے۔

۲۔ انت عبدی و رسولی۔ آپ میرے خاص الخاص بندے اور رسول ہیں۔

۳۔ سمیتک المتوکل۔ میں نے آپ کا نام متوکل رکھ دیا کیونکہ ہر معاملے میں آپ مجھ پر توکل کرتے ہیں۔

۴۔ لیس بفظ ولا غلیظ۔ نہ آپ درشت خو ہیں اور نہ سخت دل ہیں۔

۵۔ ولا سخاب فی الاسواق۔ نہ بازاروں میں شور و شغب کرنے والے ہیں۔

۶۔ ولا یدفع السیئۃ بالسیئۃ۔ برائی کا بدلہ برائی سے کبھی نہیں دیتے۔

۷۔ ولکن یعفو و یغفر بلکہ معاف فرماتے اور درگذر کرتے ہیں۔

گویا آپ قرآنی حکم ادفع بالتی ھی احسن۔ برائی کا بدلہ بہت عمدہ طریقے پر دیا کرو، پر عمل پیرا ہیں۔

۸۔ ولا یقبضہ اللہ حتی یقیم بہ الملۃ العوجاء۔ اللہ آپ کو اس وقت تک وفات نہیں دے گا جب تک گمراہ قوم کو آپ کے ذریعہ سیدھے راستے پر نہ لے آئے۔ یعنی جب تک یہ لوگ کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ کر مسلمان نہ ہوجائیں۔

۹۔ ویفتح بہ اعینا عمیا آپ کو اس وقت تک وفات نہیں دے گا جب تک کافروں کی اندھی آنکھوں کو بینا نہ فرمادے۔

۱۰۔ و اذانا صما و قلوبا غلفا اور بہرے کان اور پردے پڑے دلوں کو نہ کھول دے۔ بعض روایتوں میں یہ صفات بھی مزید بیان کی گئی ہیں:۔

۱۱۔ اُسَدِّدُہ بکل جمیل ہر عمدہ خصلت سے آپ کی تسدید یعنی درستی کرتا رہوں گا۔

۱۲۔ واھب لہ کل خلق کریم ہر اچھی خصلت آپ کو عطا کرتا رہوں گا۔

۱۳۔ واجعل السکینۃ لباسہ و شعارہ میں اطمینان کو آپ کا لباس اور شعار اور (بدن سے چپٹے ہوئے کپڑوں کی طرح) بنادوں گا۔

۱۴۔ والتقوی ضمیرہ پرہیزگاری کو آپ کا ضمیر یعنی دل بنادوں گا۔

۱۵۔ والحکمۃ معقولہ حکمت کو آپ کی سوچی سمجھی بات بنادوں گا۔

۱۶۔ والصدق والوفاء طبیعتہ سچائی اور وفاداری کو آپ کی طبیعت بنادوں گا۔

۱۷۔ والعفو والمعروف خلقہ معافی اور نیکی کو آپ کی عادت بنادوں گا۔

۱۸۔ والعدل سیرتہ والحق شریعتہ والھدی امامہ والاسلام ملتہ۔ انصاف کو آپ کی سیرت حق کو آپ کی شریعت ہدایت کو آپ کا امام اور دین اسلام کو آپ کی ملت کا درجہ دوں گا۔

۱۹۔ احمد اسمہ اھدی بہ الضلالۃ۔ آپ کا نام نامی (لقب) احمد ہے آپ ہی کے ذریعہ تو میں لوگوں کو گمراہی کے بعد سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔

۲۰۔ واعلم بہ بعد الجھالۃ جہالت تامہ کے بعد میں آپ ہی کے ذریعہ علم و عرفان لوگوں کو عطا کروں گا۔

۲۱۔ وارفع بہ الخمالۃ آپ ہی کے ذریعہ میں اپنی مخلوق کو پستی سے نکال کر بام عروج تک پہنچاؤں گا۔

"ہندوستانی مسلمانوں کے لئے انگریزی اور عربی دونوں اجنبی و بیگانہ زبانیں تھیں"

عربی زبان ان تمام ذرائع اور ترغیبات سے محروم تھی جو انگریزی زبان کو حاصل تھیں، لیکن پوری ایک صدی میں انگریزی میں اسلامیات پر اتنی کتابیں بھی نہیں پیش کی جاسکتیں جو انگلیوں پر گنی جاسکیں ـــــ انگریزی کے دو تین مصنف سے

(بقیہ ص ۱) کے وسیع و عمیق سمندر کی تہہ میں سے موتی نکالنے اور خرمن علم کی ریزہ چینی کا اعلیٰ نمونہ ہیں جن پر ہماری اردو زبان اور نئے دور کو فخر کرنے کا حق ہے، عمر خیام ایران کا سرمایۂ فخر اور مایہ ناز شاعر و ریاضی داں ہے، لیکن خود ایران اس کے علمی کمالات کی صحیح نقاب کشائی اور علمی و تاریخی تحقیق و کاوش میں اس کتاب کی کوئی نظیر نہیں پیش کر سکتا، اسی طرح "نقوش سلیمانی" میں اردو زبان کے بہت سے الفاظ و محاورات کی تحقیق خاص طور پر "تمہید" کے سلسلے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے تحقیقی کام کرنے والوں کو بحث و تحقیق اور غور و فکر کا مواد ملتا ہے اور نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ متعدد اسلامی ملکوں کے برخلاف ہندوستان کے علماء علم و تحقیق کے قافلے سے بچھڑنے نہیں پائے اور انہوں نے اپنے ملک کے زبان و ادب سے ناطہ نہیں توڑا، جیسا کہ متعدد اسلامی اور بعض عرب ملکوں میں پیش آیا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان علماء نے ایک طویل عرصے تک سیاست اور ملک کی تحریک آزادی کی طرح ان علمی و ادبی میدانوں میں بھی قائدانہ کردار ادا کیا اور ادب و تنقید، شعر و ادب میں بعض ایسی یادگاریں چھوڑیں جو ان کے پاکیزہ ادبی ذوق، زبان کی اداشناسی و مزاج دانی اور تنقیدی صلاحیت کی آئینہ دار ہیں، اور اس میدان میں خواہ ان کو ابتدائی کوششوں کا نام دیا جائے، وہ سنگ میل کی، خواجہ الطاف حسین حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری" اور "یادگار غالب"، مولانا شبلی کا "موازنہ انیس و دبیر" مولانا عبد السلام ندوی کی "شعر الہند"، اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور خواہ اس موضوع پر علم و تحقیق کا قدم کتنا ہی آگے بڑھ جائے اور اس میں کتنا ہی بیش بہا اضافہ ہو، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ گیسوئے اردو کے سنوارنے اور زبان و ادب کی خاطگی میں ان پیش رو مصنفین کا احسان بھلایا نہیں جاسکتا۔

فضلائے گرامی! آپ حضرات سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ انیسویں صدی عیسوی کے کم سے کم وسط سے عالم اسلام بالخصوص اس کے چار ملکوں، ترکی، مصر، ایران و ہندوستان کو مغربی تہذیب، مغربی تعلیم اور مغربی افکار و اقدار اور فلسفوں کا رو در رو سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس میں ہندوستان کا قدم دوسرے مسلم اور عرب ملکوں سے آگے ہے کہ مغربی تہذیب اور علوم کے سب سے طاقتور و پرجوش نمائندہ برطانیہ نے شروع ہی میں اس پر مکمل سیاسی تسلط حاصل کر لیا اور جب کہ مذکورہ بالا ممالک اس تہذیب و تعلیم سے بالواسطہ اور اس کی علمی، ادبی ایجنسیوں کے ذریعہ متاثر ہو رہے تھے، وہ کامل طور پر مغرب کے سیاسی، ذہنی اور علمی و تہذیبی اقتدار کی تحویل و نگرانی میں آگئے تھے، ہندوستانی مسلمان انگریزی زبان کے سیکھنے اور اس کے ادب، انشاء و تحریر اور خطابت و تقریر میں قابلیت پیدا کرنے پر مجبور ہو رہے تھے، قصبے قصبے انگریزی اسکولوں کے کھل جانے، بڑے شہروں میں کالجوں . . . اور صوبوں کے مرکزی شہروں میں یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آ رہا تھا، انگریزی اخبارات جاری ہو رہے تھے، انگریز حکام و دانشوروں کے ساتھ صحبت و اختلاط کے مواقع مہیا تھے، انگلستان کی شہرۂ آفاق یونیورسٹیوں بالخصوص کیمبرج اور آکسفورڈ کی طرف اعلیٰ خاندانوں اور کھاتے پیتے گھرانوں کے بہترین نوجوان بڑی تعداد میں رخ کر رہے تھے، وہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے اور انگریزی زبان و ادب کو اوڑھنا بچھونا بنا لیتے اس پر مستزاد ۱۸۵۷ء میں سر سید احمد خاں مرحوم جیسی . . . . طاقتور شخصیت کے ہاتھوں مدرسۃ العلوم کے نام سے علی گڑھ میں ایک دانش گاہ کا قیام عمل میں آیا جس میں ذہنی، علمی، اخلاقی قیادت مسٹر بیک (Mr. Beck) و مسٹر ماریسن (Mr. Morison) اور مسٹر آرچبولڈ (Mr. Archbold) جیسے فاضل اور اثر انگیز اساتذہ اور منتظمین کے ہاتھ میں تھی، پھر ۱۹۲۰ء میں اس نے یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر لیا۔ اس تحتی برِ اعظم کے ذہین نوجوان مسلمانوں کے لئے اس میں مقناطیس ہی کشش تھی، جس نے خلیج بنگال سے لے کر درۂ خیبر تک کے باصلاحیت مسلمان خاندان کے جگر گوشوں کو اپنی طرف اس طرح کھینچ لیا جس طرح مقناطیس آہن پاروں کو کھینچ لیتا ہے، دوسری طرف اس ملک کی دینی حس اور ملی غیرت دوسرے اسلامی ملکوں کے مقابلہ میں ان اسباب کی بنا پر (جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں اور میں اپنی بعض ناچیز تصنیفات و مضامین میں ان کا تفصیل سے ذکر کر چکا ہوں) زیادہ تیز اور طاقتور تھی جس کا ایک ثبوت تحریک خلافت میں ہندوستانی مسلمانوں کا دنیا کے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا اور اپنی اسلامی تہذیب اور دینی شعائر پر اس سے زیادہ ثبات اور استقامت کا مظاہرہ کرنا جتنا دوسرے ملکوں نے کیا ہے۔

یہ صورت حال اور یہ حقائق جن سے کوئی باخبر ہندوستانی مسلمان انکار نہیں کر سکتا اس بات کے مقتضی بلکہ ضامن تھے کہ کم سے کم ہندوستان میں اسلام کے عقائد و اصول شریعت و قانون اسلامی، اسلامی تہذیب و تمدن مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے دور قیادت و عظمت، مسلمانوں کے نظام حکمرانی و سیاست، اسلامی اقتصادیات اور اسلامی فلسفۂ اخلاق پر انگریزی میں کثیر تعداد میں بلند معیار کی کتابیں لکھی جائیں گی، اور بحث و تحقیق، مغربی تہذیب پر تنقید اور اسلام کی ترجمانی و تشریح کے لئے انگریزی زبان کو اظہار خیال اور اظہار کمال کا ذریعہ بنایا جائے گا اور اس پر کم سے کم وقت میں ایک وسیع کتب خانہ (Library) تیار ہو جائے گی جو ایک طرف مسلمان نوجوانوں میں خود اعتمادی و خود نگری کا جوہر پیدا کرے گی، دوسری طرف یورپ کے دانشوروں اور خاص طور سے برطانیہ کے فضلاء و مصنفین و مستشرقین کو اگر اسلام کا حلقہ بگوش نہ بنا سکے گی تو کم سے کم ان کو اسلام کے سنجیدہ اور مخلصانہ مطالعہ پر آمادہ کرے گی اور اسلامی تحقیقات (اور آج کل کی زبان میں علمی و ادبی تخلیقات) کا ایک سیل رواں جاری ہوگا جو ان دانشگاہوں سے نکل کر سارے ملک کو سیراب کر دے گا اور اس کی لہریں کیمبرج و آکسفورڈ اور برمنگھم و ایڈنبرا کی یونیورسٹیوں کی دیواروں سے ٹکرائیں گی۔ انگریزی پر عبور رکھنے والے یہ مسلمان فضلاء کم سے کم اسلامی تاریخ، اسلامی قانون اور عربی فارسی اور اردو زبان و ادب، شاعری کی تاریخ و تنقید کے سلسلے میں اپنی یونیورسٹیوں اور کالجوں کو خود کفیل بنا دیں گے اور ان موضوعات کا مطالعہ کرنے والوں کو عرب و ایران کی ادبی تاریخ کے معلومات کے لئے کسی نکلسن (NICHOLSON) کسی براؤن (BROWNE) اور کسی ہٹی (HITTI) کی احتیاج نہ رہے گی اور جہاں تک شریعت اسلامی کی تاریخ اور حدیث و فقہ کی ترتیب و تدوین کا تعلق ہے کسی گولڈ زیہر (GOLDZIHER) اور کسی شاخت (SCHACHT) کی ضرورت نہ ہوگی، جہاں تک عربی ادب و شاعری، قرآن کی زبان اور اس کے علوم کا تعلق ہے کسی مارگولیتھ (MARGOLIOUTH) کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے گا جہاں تک اسلامی دور میں تصنیف و تالیف کی تحریک اور مسلمانوں کے آثار علمیہ اور ان کی قلمی کاوشوں کا تعلق ہے ان سے واقف ہونے کے لئے کسی بروکلمن (BROCKELMANN) کا دریوزہ گر ہونے کی ضرورت پیش نہ آئے گی، اور اس طرح مسلمان تعلیم یافتہ نوجوان نہ صرف اس ذہنی و تہذیبی ارتداد کے خطرے سے محفوظ ہو جائیں گے جو تیزی کے ساتھ ان ملکوں میں پھیل رہا تھا جو مغرب کے زیر اقتدار تھے بلکہ وہ مغرب میں اسلام کی تبلیغ، قرآن مجید اور سیرت نبوی سے متعارف کرانے اور اسلام کے چشمۂ حیات پر لانے کا ذریعہ بھی بن سکیں گے،

زیادہ نہیں ملتے جنہوں نے اسلام اور اسلامی تہذیب و تاریخ پر ایسی کتابیں لکھیں جو اہل مغرب کو متاثر کرسکیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اسی صدی میں عربی زبان میں اتنا بڑا تحقیقی اور تصنیفی کام ہوا جس پر ہندوستان کے قدیم نصاب تعلیم کو فخر کرنے کا حق ہے۔"

"شمع علم کے یہ پروانے، عہدوں، بڑی تنخواہوں، ترقی حاصل کرنے سے بے نیاز ہو کر اپنا کام انجام دیتے تھے"

سارے دلائل و قرائن اس بات کے حق میں تھے کہ ہندوستان میں اسلامیات پر تحقیق و تصنیف کا ایک نیا دور شروع ہوگا ــــ انگریزی زبان ان بلند معیار کتابوں سے مالامال ہو جائے گی جو زبان کی شیرینی و دلآویزی، استدلال کی مضبوطی، مواد کے حسن ترتیب اور پیش کرنے کے سلیقے کی بنا پر اہل زبان کے لئے بھی دلکشی و دلچسپی کا سامان رکھتی ہوں گی۔

لیکن مجھے آج اس موقر مجلس میں جس میں ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے چیدہ فضلاء اسلامیات اور السنۃ المشرقیہ کے معلم و ناقد جمع ہیں، اپنے اس تاریخی و علمی استعجاب کے اظہار کی اجازت دیجئے کہ ہندوستان کا ایک دیانتدار و وسیع النظر مورخ یہ معلوم کر کے حیران رہ جاتا ہے کہ یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔

اگر ہم ہندوستانی مسلمانوں میں انگریزی زبان و ادب کی تعلیم و تحصیل کی تاریخ ۱۸۵۷ء کے بجائے (جب ہندوستانی مسلمان ہمہ گیر شکست کے صدمے سے دوچار اور انگریزوں کے پے در پے فتوحات سے سراسیمہ و بدحواس ہو رہے تھے) ۱۸۷۵ء سے شروع کریں جب علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد پڑی اور اس کو احتیاطاً ۱۹۷۵ء پر ختم کر دیں تو ایک پوری صدی کی جس میں تنہا ایم۔ اے۔ او کالج اور بعد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ایسے فضلاء بھی پیدا کئے جن کی دینی حمیت معروف اور جن کا انگریزی زبان پر اہل زبان کی طرح عبور مسلّم و مشہور ہے صرف اتنی کتابیں بھی انگریزی زبان میں پیش نہیں کر سکتی ہے جو انگلیوں پر گنی جاسکیں، ہمیں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں انگریزی کے دو تین مصنف سے زیادہ نہیں ملتے جنہوں نے اسلام اور اسلامی تہذیب و تاریخ پر ایسی کتابیں لکھیں جو اہل مغرب سے اپنے تصانیف کی زبان دانی کا لوہا منوا سکیں یا اپنے مواد و مضامین اور ان کو پیش کرنے کے طریقے سے اہل مغرب کو متاثر کرسکیں۔

ان میں سر فہرست نام رائٹ آنریبل سید امیر علی کا ہے جن کی کتاب (SPIRIT OF ISLAM) نے (جس کے سارے خیالات و نتائج بحث سے اتفاق کرنا مشکل تھا) انگلستان کے علمی و ادبی حلقے سے خراج تحسین وصول کیا، اور بہت سے ذہین اور فاضل نوجوان اس کو پڑھ کر اسلام کی صداقت کے قائل ہو گئے، ان کی دوسری کتاب (HISTORY OF THE SARACENS) اپنی زبان کی سلاست، تحریر کی شگفتگی اور توازن کی وجہ سے عرصے تک مقبول اور متداول رہی، دوسرا ہندوستانی مسلمان مصنف جس کی کتابوں سے باہر کی دنیا متعارف ہے صلاح الدین خدا بخش ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان کے بہت سے خیالات سے اسلام کا صحیح علم رکھنے والے فضلاء کو شدید اختلاف پیدا ہوا اسی بات میں ان سے بڑھ کر مولوی محمد علی لاہوری امیر جماعت احمدیہ لاہور اور خواجہ کمال الدین کا نام لیا جاسکتا ہے جن کی کتابیں کسی زمانہ میں اور یہ افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے) اسلام کے سمجھنے کا واحد ذریعہ سمجھی جاتی تھیں، لیکن جمہور مسلمین و مسلک اہل سنت سے ان کی علیحدگی اور اول الذکر کے متجددانہ خیالات مغربی فلسفہ اور علم طبیعیات (جو ابھی دور طفولیت میں تھا) سے ضرورت سے زیادہ مرعوبیت اور غیبی حقائق، معجزات انبیاء اور ماوراء عقل بیانات کی دور از کار تاویلات اور ان کو عصری معلومات اور طبعی اصولوں کے مطابق بنانے کی پر تکلف کوشش نے ان کی کتابوں کی دینی و علمی قدر و قیمت کو مجروح کر دیا۔ پھر یہ کتابیں مدافعانہ انداز اور معذرت آمیز لہجہ میں لکھی گئی تھیں، جو ہمیشہ کمزور اور غیر موثر ہوتا ہے۔

اس کے بعد اگر کسی ایسے بلند پایہ مصنف کا نام لیا جاسکتا ہے جس نے انگریزی میں کوئی ایسا کام کیا جس نے باہر کی دنیا کو متوجہ کر لیا اور مغربی فضلاء نے اس سے استفادہ کیا اور اپنی کتابوں میں اس کے حوالے دیے تو وہ علامہ اقبال اور علامہ عبد اللہ یوسف علی ہیں۔ اول الذکر کی شہرۂ آفاق کتاب تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (Reconstruction of Religious thought in Islam) جو ان کے مدراس کے خطبات کا مجموعہ ہے اور جو اپنے بعض تفردات کے باوجود ایک فکر انگیز اور پر مغز کتاب ہے اور جس کو مغرب کے چوٹی کے دانشوروں نے اہمیت دی اور اس کے اقتباسات اپنی کتابوں میں نقل کئے، اور ثانی الذکر کا ترجمۂ قرآن مجید جو اپنی ادبیت، موسیقیت اور زور بیان کی بدولت یورپ و امریکہ میں مقبول ہوا اور اس کے کثیر التعداد ایڈیشن پاکستان، سعودی عرب، بیرونی ممالک سے شائع ہوئے۔

ایم۔ ایم پکتھال (M.M. PICKTHALL) کے ترجمۂ قرآن مجید کے زبان و اسلوب کی دلنشینی اور انفرادیت کا اہل علم کو اعتراف ہے اور اس ترجمۂ قرآن مجید نے بھی بڑی مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔

اس سلسلے میں جب کہ قرآن کے انگریزی ترجمے کا ذکر آگیا ہے بڑی ناانصافی ہوگی اگر مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی مرحوم کے ترجمۂ قرآن کا ذکر نہ کیا جائے، اس ترجمے کی اصل قدر و قیمت اس کے وہ فاضلانہ نوٹس ہیں جو مولانا کے وسیع و عمیق مطالعۂ مذاہب تاریخ مذاہب پر وسیع نظر یہودی و عیسائی ماخذ سے پورے استفادے پر مبنی ہیں اور ان سے قرآن مجید کے بیانات اور اس کے علوم و حقائق کی صداقت اور اعجاز قرآن کے ثابت کرنے کا کام لیا گیا ہے اور جس میں مولانا اس عہد کے مترجمین قرآن مجید میں منفرد نظر آتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس محنت کی ابھی تک پورے طور سے قدر نہیں کی گئی اور اس ترجمے کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کا وہ مستحق ہے۔

اس طبقے کے بعد انگریزی میں اسلامیات پر کام کرنے والوں میں جس کا نام سب سے زیادہ روشن ہے وہ ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر حمید اللہ حیدرآبادی حال مقیم پیرس ہیں ان کی دو کتابیں خاص طور پر یہاں قابل ذکر ہیں، ایک (INTRODUCTION OF ISLAM) دوسرے محمد رسول اللہ (MUHAMMADUR RASOOLULLAHE) جن کے ذریعہ ان ہزاروں مسلمانوں کو جن کی واقفیت کا ذریعہ صرف انگریزی زبان ہے اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے سمجھنے کا موقع ملا لیکن ان کی بحث و تحقیق اور دماغی کاوش اور دیدہ ریزی کا اصل مظہر ان کی کتاب صحیفہ ہمام ابن منبہ (SAHIFA HAMMAM IBN MUNABBIH) جس میں انہوں نے ثابت کیا ہے کہ حدیث کی جمع و ترتیب و تدوین کا کام عہد نبوی ہی سے شروع ہو گیا تھا اور مسلسل طریقے پر اصحاب صحاح و سنن تک جاری رہا اور اس میں کوئی مختصر سے مختصر وقفہ اور خلا پایا نہیں جاتا۔ اس کتاب کو لکھ کر انہوں نے نہ صرف حدیث بلکہ اسلام کی ایسی وقیع علمی خدمت انجام دی ہے جس کا اعتراف کرنا ضروری ہے اسی سلسلے میں ہندوستان کے اسی صوبے کے ایک جواں سال فاضل ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی کی خدمت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جنہوں نے اسی دعوے کا دستاویزی ثبوت فراہم کیا اور اپنی فاضلانہ کتاب (STUDIES IN EARLY HADITH LITRATURE) لکھ کر ڈاکٹر حمید اللہ کے کام کو آگے بڑھایا اور اس کو زیادہ مدلل و مفصل طریقے پر ثابت کیا۔

ایم۔ اے۔ شوشتری کی کتاب (Outlines of Islamic Culture) اور احمد فاروقی کی (THE MUJADDIDID'S CONCEPTION OF TAUHID)

پر انگریزی لٹریچر میں ایک مفید اضافہ ہے۔

انگریزی میں اسلامیات پر کام کرنے والوں میں حیدرآباد کے ڈاکٹر سید عبداللطیف مرحوم (جو قرآن کے مترجم بھی ہیں) ڈاکٹر میر ولی الدین، حافظ غلام سرور، خالد لطیف گابا، ڈاکٹر سید مقبول احمد، الحاج مولانا فضل الکریم، سید اطہر حسین صاحب اور سید محی الدین صاحب کا نام تعریف و اعتراف کے ساتھ لیا جاسکتا ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ اس پوری صدی کے طویل رقبے کو پُر و آراستہ کرنے کے لیے ناکافی ہے جو ۱۸۷۵ء سے شروع ہوتا ہے اور ۱۹۷۵ء پر ختم ہوتا ہے، حیرت کی بات بھی ہے اور اسلام کی قوت تسخیر اور اس کی علمی فتوحات کی دلیل بھی کہ اس نصف صدی کے اندر سب سے زیادہ طاقتور، پر از اعتماد بلکہ اعتماد آفریں اور ایمان پرور دو کتابیں لکھی گئیں وہ دونوں ایک نومسلم کے قلم سے ہیں میری مراد محمد اسد صاحب سابق (Leopold Weiss) سے ہے جو جرمن نژاد اور یہودی النسل نومسلم فاضل ہیں اور جنہوں نے اپنی پہلی کتاب ..... (ISLAM AT THE CROSSROADS) ..... لکھ کر نہ صرف اس تختی برّاعظم میں ایک ذہنی حرکت بلکہ اعتماد و یقین کی ایک نئی کیفیت پیدا کردی، اسلامی شریعت، اسلامی تہذیب اور حدیث و سنت کی طرف سے عرصے سے ایسی پرزور وکالت نہیں کی گئی تھی جیسی اس کتاب میں نظر آئی ہے نیز مغربی تہذیب و اسلامی تہذیب کے بنیادی اختلاف اور مغربی تہذیب پر ایسی عالمانہ و پرزور تنقید کسی مغربی فاضل کے قلم سے نہیں ملے گی۔ ہم کو خوشی اور فخر ہے کہ یہ کتاب ان کے ہندوستان کے زمانۂ قیام میں لکھی گئی عربی میں اس کا ترجمہ "الاسلام علی مفترق الطرق" کے نام سے ہوا اور اس نے عرب نوجوانوں میں بھی ایک نئی قوت ایمانی پیدا کردی ان کی دوسری کامیاب تصنیف (ROAD TO MECCA) ہے جو یورپ و امریکہ میں بڑی دلچسپی اور شوق سے پڑھی گئی انہوں نے بڑی سبکدستی بلکہ چابکدستی کے ساتھ اسلامی حقائق، اس کی تہذیب کی برتری اور اس کے دین کی آفاقیت و انسانیت کو بڑی خوبی سے ذہن نشین کیا ہے، جزیرۃ العرب، اسلامی ملکوں کے معاشرے کی صحیح تصویر، اپنے دلچسپ صحرائی سفر کے تجربات اور مہم جوئی (ADVANTURES) کے ضمن میں اور اچھی ادبی انگریزی زبان کے غلاف میں لپیٹ کر اہل مغرب بالخصوص امریکن سوسائٹی کے افراد کے کام و دہن سے اتارنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں اس کتاب کا ترجمہ عربی میں "الطریق الی مکۃ" اور مصنف کی اجازت سے اردو میں "طوفان سے ساحل تک" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، ہندی میں "جب آنکھ جاگی" ".... आत्मा ...." کے نام سے اس کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔

امریکن نومسلم فاضلہ مسز مریم جمیلہ سابق (MARGARET MARCUS) کی انگریزی تصنیفات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا جو ان کے عمیق مطالعہ، اسلام کی صحیح ترجمانی اور تہذیب مغرب کے طلسم سے دماغ کی مکمل آزادی بلکہ بغاوت کی شاہد ہیں، (ISLAM VURSUS THE WEST) اور (ISLAM AND MODERNISM) ان کی یہ کتابیں بہت خیال افروز اور بصیرت افروز ہیں۔

اس موقعہ پر میں قصداً اسلامیات کے اس وسیع و وقیع ذخیرے کے مصنفین کا نام نہیں لیتا جو اصلاً اردو یا عربی میں لکھی گئی تھیں پھر ان کو انگریزی میں منتقل کیا گیا ان کی فہرست طویل ہے اور آپ ان سے واقف ہیں اس سلسلے میں سید قطب، محمد قطب، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیفات اور مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ کی ان انگریزی مطبوعات کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جو عنقریب آپ کے سامنے آئیں گی۔

حضرات! اب مجھے تھوڑی سی جرأت کی اور اجازت دیجئے کہ میں یہ کہوں کہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے انگریزی اور عربی دونوں اجنبی و بیگانہ زبانیں تھیں، جو وہ صرف اپنے مطالعہ اور مشق کے ذریعہ حاصل کرسکتے تھے اور ان میں تصنیف و تالیف کا کام دشوار بھی تھا اور نازک بھی، لیکن اس لحاظ سے ان دونوں زبانوں میں بڑا فرق ہے کہ انگریزی زبان کے حاصل کرنے اور اس میں اظہار خیال کی قابلیت و قدرت پیدا کرنے کے بہترین ذرائع ہندوستان میں پائے جاتے تھے، اس کے سکھلانے والے ابتدا میں اہل زبان اور بعد میں ان کے باکمال اور ماہر تعلیم شاگرد تھے، اخبارات و رسائل اور جدید مطبوعات کا بھی ایک سیلاب تھا جو انگلستان اور خود ہندوستان سے امنڈتا رہتا تھا، پھر اس میں کمال پیدا کرنے اور اہل زبان کی طرح مشق بہم پہنچانے کے قوی محرکات و دواعی بھی موجود تھے، اس محنت کا صلہ بھی ملتا تھا اور اس کامیابی پر شہرت و نیک نامی بھی حاصل ہوتی تھی۔

اس کے برخلاف عربی زبان ان تمام ذرائع و ترغیبات سے محروم تھی جو انگریزی زبان کو حاصل تھیں۔ یہاں اہل زبان کو دیکھنے کو آنکھیں اور ان کی باتیں سننے کو کان ترستے تھے۔ آمد و رفت کے (سوائے حج کے جو ایک عبادت اور دینی سفر ہے) وسائل و تقریبات بھی ہندوستان کے آزاد ہونے تک مفقود تھیں، تصنیف کے بعد طباعت و اشاعت کا یقین جو ایک مصنف کے لئے مہمیز کا کام دیتا ہے ہندوستان میں تقریباً مفقود تھا، عربی میں تصنیف کرنے والوں کو نہ حکومت کی سرپرستی حاصل تھی نہ اداروں کا تعاون، نہ پڑھنے والوں کی ہمت افزائی، خود ہی لکھنا خود ہی پڑھنا "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ"، کا مضمون، ایسی حالت میں اگر عربی میں ایک بھی اعلیٰ معیار کا تحقیقی و تصنیفی کام نہ ہوتا اور کوئی عالم کسی اسلامی یا علمی موضوع پر جگر کاوی و دیدہ ریزی سے کام نہ لیتا تو قطعاً محل تعجب نہ تھا بلکہ ہر طرح قرین قیاس اور توقع کے عین مطابق تھا۔

گیسوئے اُردو کے سنوارنے اور زبان وادب کی مشاطگی میں پیشرو مصنّفین کا احسان بھلایا نہیں جاسکتا۔

لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ یہاں اس ایک صدی میں جس کو ہم

اسلامی تقویم کے اعتبار سے سنہ ۱۲۱۰ھ سے شروع کرکے ۱۳۹۸ھ پر ختم کرسکتے ہیں عربی زبان میں اتنا بڑا تحقیقی اور تصنیفی کام ہوا جو نہ صرف اپنی کیفیت اور جوہر (QUALITY) کے لحاظ سے بلکہ اپنی کمیت اور حجم (QUANTITY) کے لحاظ سے بھی موجب حیرت ہے اور جس پر ہندوستانی مسلمانوں کو اگر آپ اجازت دیں تو ہندوستان کے قدیم نظام تعلیم کو بھی فخر کرنے کا حق ہے۔

میں اس سلسلے میں صرف چار کتابوں کا نام لوں گا

ایک مولانا محمود حسن خاں ٹونکی (م ۱۳۶۶) کی کتاب "معجم المصنفین" کا جو مصنفینِ اسلام کے سلسلے میں ایک دائرۃ المعارف (ENCYCLOPEDIA) کی حیثیت رکھتی ہے۔ ساٹھ جلدوں اور بیس ہزار صفحات پر مشتمل اس کتاب میں چالیس ہزار مصنفین کے حالات درج ہیں، کتاب کی وسعت اور ہمہ گیری کا اندازہ اس سے ہوگا کہ مصنف نے دو ہزار ایسے مصنفین جمع کئے ہیں جن کے نام احمد ہیں، اس کتاب میں ڈیڑھ ہزار کتابوں کا عطر آگیا ہے۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائے عہد تاریخ سے ۱۳۵۰ھ تک ان تمام اشخاص کا تذکرہ موجود ہے جنہوں نے عربی زبان میں ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ **اس کتاب کے صرف چار حصے مرحوم حکومت حیدرآباد کے مصارف پر بیروت میں چھپے تھے۔ بقیہ جلدیں غالباً کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہیں میں اس موقر مجلس میں اس لیے اس کا ذکر کر رہا ہوں کہ شاید کسی ادارہ، تنظیم یا حکومت کو اس علمی خزانے کو محفوظ اور عام کرنے کی طرف توجہ ہو جائے۔**

اس کے بعد میں ان تین کتابوں کا ذکر کروں گا جو اسی ادارے کے بانیوں میں سے ایک عالم کی تصنیف ہیں اور میرے لئے ان کے تذکرہ میں یقیناً یہ حقیقت مانع نہیں ہونی چاہیے کہ وہ میرے والد ماجد تھے کہ علم و تاریخ میں اس شرم و لحاظ کی ضرورت نہیں، میری مراد مولانا حکیم سید عبدالحی صاحبؒ کی ان تین کتابوں سے ہے جن کا تعلق ہندوستان کی سرزمین

اور ان کے دور قیادت و ترقی سے ہے ان میں سے پہلی کتاب "نزہۃ الخواطر" آٹھ جلدوں اور ساڑھے چار ہزار سے زائد تراجم پر مشتمل ہے۔ یہاں اس کی دوسری فنی اور تصنیفی خصوصیات سے بحث نہیں کہ ان پر تفصیل کے ساتھ کتاب کے مقدمہ اور "حیات عبدالحی" کے صفحات پر گفتگو کی جاچکی ہے، ایک خصوصیت کا ضرور ذکر کروں گا کہ اس کتاب کی بدولت ہندوستان کو تمام اسلامی ممالک میں یہ فخر کرنے کا حق حاصل ہے کہ صرف اسی کے اعیان و مشاہیر کی تاریخ و تذکرہ مسلسل و مکمل طور پر موجود ہے اور وہ جغرافیائی حدود، زمانی اختلافات اور طبقاتی و مسلکی تنوعات سے بے نیاز ہو کر ہر اس شخص کا تذکرہ پیش کرتا ہے جس نے کچھ امتیاز پیدا کیا، اور کوئی یادگار چھوڑی،

ترکی، مصر و شام حتی کہ ایران کی مردم خیز سرزمین بھی کوئی ایسا تذکرہ نہیں پیش کرسکتی جو اس کی ہزار سالہ بلکہ سیزدہ صد سالہ تاریخ پر حاوی ہے یہ کام اکیڈیمی کا تھا جو ایک آدمی نے انجام دیا۔

تنہا یہی کتاب مصنف کو اپنے ملک اور علمی دنیا کے سامنے سرخرو کرنے کے لئے کافی تھی، لیکن انہوں نے دو کتابیں عربی میں اور لکھیں ان میں سے ایک "جنۃ المشرق و مطلع النور المشرق" ہے جو عہد اسلامی کے ہندوستان کا آئینہ اور خطط کی ان کتابوں میں ایک وقیع اضافہ ہے جس کا بہترین نمونہ مقریزی کے "خطط مصر" اور لسان الدین الخطیب کی "الاحاطہ فی اخبار غرناطہ"، ہے اس کتاب کا ترجمہ بھی اردو میں "ہندوستان اسلامی عہد میں"، میں اور انگریزی میں (INDIN DURING MUSLIM RULE) کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کی تیسری کتاب جو ان دونوں سے کم اہم اور محنت طلب نہیں تھی "معارف العوارف فی انواع العلوم والعوارف" ہے جو گویا ہندوستان کے اسلامی عہد کی علمی و تصنیفی ڈائرکٹری ہے، اس میں نصاب درس کی عہد بعہد تبدیلیوں، اضافوں اور ترمیمات کا پورا نقشہ اور ہر علم و فن پر علمائے ہند کی چھوٹی بڑی تصنیفات کا مرقع ہے گویا وہ ہندوستان کے لیے "کشف الظنون" کا درجہ رکھتی ہے اس کتاب کو ۱۹۵۷ء میں دمشق کی شہرۂ آفاق علمی اکیڈیمی "المجمع العلمی العربی" نے "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند"، کے نام سے بڑی آب و تاب سے شائع کیا اور عالم عربی اور مغربی دنیا میں بڑے قدر کے ہاتھوں سے لی گئی اس کا ترجمہ اردو میں دارالمصنفین نے "ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون"، کے نام سے شائع کیا اور اس کی سخت ضرورت ہے کہ انگریزی اور فرنچ میں بھی اس کو منتقل کیا جائے، کہ اس موضوع پر اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں۔

عربی زبان میں ٹھوس تحقیقی کام کرنے والوں کی زرین فہرست میں علامہ عبدالعزیز میمن (سابق صدر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ و حال مقیم کراچی) کا نام بھی شامل کرنا ضروری ہے، انہوں نے لاہور و علی گڑھ میں بیٹھ کر عربی زبان و ادب کی تحقیق اور اس کے اشعار و الفاظ کی تصحیح و تنقیح اور لغت و نحو اور شعر و ادب کی قدیم کتابوں کو تحقیق سے شائع کرنے اور ان کو اپنی تحقیقات و افادات سے مزین کرنے، مختلف قدیم قلمی نسخوں سے اُس کا مقابلہ کرنے کا وہ عظیم الشان کام انجام دیا جس کی نظیر بلاد عربیہ میں مشکل سے ملے گی، اس کا نتیجہ ہے کہ ان کو مشرق وسطیٰ کی مختلف اکیڈیمیوں کا رکن اور لسان العرب کی تصحیح کی موقر کمیٹی میں شامل کرکے ادباء عرب نے ان کی وسیع النظری اور دقیقہ رسی کا اعتراف کیا "ابوالعلاء وما الیہ"، اور "سمط اللآلی" ان کی محنت و عرق ریزی اور عربی زبان پر عبور کی شاہد ہے،

میرے ایک سوال پر حال میں انہوں نے بتایا کہ ان کو پون لاکھ سے ایک لاکھ تک عربی کے اشعار یاد ہوں گے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی زبان، ادب و علم میں کمال و امتیاز پیدا کرنے اور داد تحقیق دینے کے لیے اپنا ذاتی علمی شغف کافی ہے، اور علم سفر بھی ہے اور منزل بھی، محنت بھی ہے اور اس کا انعام بھی۔

یہاں پر میں نے طوالت کے ڈر سے علمائے ہند کی ان علمی اور تصنیفی خدمات کا ذکر نہیں کیا جو انہوں نے حدیث کے متون کی شرح اور ائمۂ حدیث کی قدیم کتابوں کی تصحیح و تحقیق کے سلسلہ میں انجام دی ہیں، اس سلسلہ میں بطور مثال کے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کی شرح موطا، جو چھ ضخیم جلدوں میں ہے اور "اوجز المسالک" کے نام سے مشہور ہے، مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری کی تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی کی اس محنت و دیدہ وری کا حوالہ دیا جاسکتا ہے جس کا انہوں نے مصنف ابن عبدالرزاق کی طباعت اور تصحیح و تحقیق میں ثبوت دیا۔

یہاں پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہمارا قدیم نظام تعلیم جس کی اساس اخلاص، زہد و جفاکشی اور اخروی ثواب کی طلب پر تھی صحیح علمی ذوق پیدا کرنے، محنت و جانفشانی کا جذبہ ابھارنے اور خاموشی و گمنامی کے ساتھ علم و تحقیق کا کام کرنے کا شوق پیدا کرنے میں زیادہ کامیاب تھا؟ اور کیا اس میں اس کو بھی دخل ہے کہ شمع علم کے یہ پروانے "عہدوں"، بڑی تنخواہوں، ترقی حاصل کرنے اور کیریر (CARRIAR) بنانے سے بے نیاز ہو کر اپنا کام انجام دیتے تھے اور اداروں اور درسگاہوں کی سیاست سے کنارہ کش ہو کر پوری یکسوئی کے ساتھ علم و تحقیق کے کام میں مصروف رہتے تھے۔

حضرات میں اس موقع پر ان جدید عربی تصنیفات کا ذکر نہیں کروں گا جو علماء ہند اور فضلاء ندوہ کے قلم سے نکلی ہیں اور مشرق وسطیٰ اور ممالک عربیہ میں ان کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں، نہ ان کتابوں کا ذکر کروں گا جو اسلامیات پر اردو میں لکھی گئیں پھر ان کا عربی میں ترجمہ ہوا کہ ان کی فہرست طویل ہے اور میں نے اپنے اس خطبے کے لئے انگریزی زبان میں اسلامیات کے اس کام کو موضوع بحث بنایا ہے، جو اس تختی براعظم میں انجام پایا۔ اس طویل سمع خراشی کے بعد آخر میں یہ عرض کروں گا کہ،

اسلامی ممالک کی فکری قیادت تو بڑی چیز ہے ان کو ذہنی انتشار بلکہ ذہنی ارتداد سے بچانے کے لیے اس کی سخت ضرورت ہے کہ ہماری علمی و ذہنی توانائیوں کا بڑا حصہ انگریزی میں اسلامی لٹریچر پیدا کرنے پر صرف ہو جو اب بھی دل و دماغ کو متاثر کرنے اور علمی حقائق کو ذہن میں بٹھانے اور اپنے دین، اپنی تہذیب، اور اپنی تاریخ کے بارے میں احساس کہتری اور خود فراموشی بلکہ خودکشی سے بچانے کے لیے جادو کا اثر رکھتی ہے اور ابھی ان ملکوں میں اس کا سحر نہیں ٹوٹا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی موقر کانفرنس جو تھوڑے وقفے کے بعد کسی ایک اہم علمی مرکز یا دانشگاہ میں منعقد ہوتی ہے اس کی طرف متوجہ کرنے کا ذریعہ ثابت ہوسکتی ہے۔ میں آخر میں یہ عرض کروں گا کہ گذشتہ نسل کے تحقیقی کام کرنے والوں کی طرف سے پیہم یہ صدا آرہی ہے کہ، ع

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

آخر میں آپ کی اس عزت افزائی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس موقر مجلس کی صدارت کے لیے مجھ طالب علم کا انتخاب کیا اور یہاں اپنی کانفرنس منعقد کرکے اس ادارے اور اس شہر کو عزت و مسرت بخشی جو عرصے تک علم و تعلیم کا ایک بڑا مرکز رہا ہے اور جس کا مرتب کیا ہوا نصاب ہندوستان اور بیرون ہند میں سکۂ رائج الوقت کی طرح رواں رہا ہے، اور یہیں سے ندوۃ العلماء کے بانیوں نے اصلاح نصاب اور جدید مطالعہ و فکر کی دعوت دی ہے۔ خدا کرے یہ کانفرنس ہر طرح اپنے مقاصد میں کامیاب اور نئے عزائم اور مساعی کا مقدمہ ثابت ہو۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

پرنٹر، پبلشر، مسئول سید محمد حسنی نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی میں چھپوا کر دفتر "تعمیر حیات" ندوہ لکھنؤ سے شائع کیا — اڈیٹر: اسحاق جلیس ندوی

پاکستان — امیدیں اور اندیشے

مولانا محمد الحسنی ندوی - ایڈیٹر "البعث الاسلامی"، ندوۃ العلماء لکھنؤ

ہمارا پڑوسی ملک پاکستان جس سے ہمارے گوناگوں مذہبی، تاریخی، سماجی، جغرافیائی اور سیاسی رشتے ہیں۔ اور وہ اسی تحتی بر اعظم کا ایک حصہ اور اس وسیع خاندان کا ایک فرد ہے، آج ایک طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد دوراہے پر کھڑا ہے۔ تیس سال کے اس طویل اور پرمشقت سفر میں اس ملک کو جتنے جھٹکے لگے ہیں اس نے اس کے اندر ایک طرح کا خوف اور بے اعتمادی پیدا کر دی ہے۔ اب خوش آیند مستقبل اور امید افزا علامتوں کو بھی دیکھ کر اس کے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے بعد مصائب و مشکلات کے کون سے پہاڑ اس کو کاٹنے پڑیں گے — اس کیفیت کا سب سے بڑا سبب صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ اس کو اس طویل عرصہ میں مخلص، سنجیدہ اور فعال قیادت بہت کم نصیب ہوئی۔ بارہا رہبروں کی صورت میں رہزنوں نے اس کی متاع دین و دانش کو لوٹا، اس کا خون چوسا یا بے دردی سے بہایا، یا سیاست کی عالمی منڈی میں اس کو فروخت کرنے کی کوشش کی۔

آج جس جگہ یہ ملک کھڑا ہے، یہ جگہ امیدوں اور اندیشوں کے بالکل درمیانی نقطہ پر واقع ہے۔

شعبان ۱۳۹۹ھ مطابق جولائی ۱۹۷۹ء میں ہم لوگوں کو اسلامی ایشیائی کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا۔ کانفرنس کے اختتام کے بعد اس ملک کو پہلی بار اچھی طرح دیکھنے کی نوبت آئی۔ اس سفر میں اللہ تعالیٰ کی جو تائید و نصرت نظر آئی اور ہمارے دوستوں، بھائیوں، بزرگوں اور کرم فرماؤں نے جس غیر معمولی تعلق و محبت اور تعاون اور ہمدردی کا مظاہرہ کیا اس کے ذکر سے میں ان کے بے پایاں خلوص، ان کے امنڈتے ہوئے جذبات اور ان کے لطیف و نازک احساسات کو مجروح نہ کروں گا اور ان ان کہی کہانیوں کا پردہ فاش نہ کروں گا جو صرف دل و نگاہ کی زبان سے کہی جاتی اور گوش دل سے سنی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ بقول جگر مرادآبادی:

"نغمہ وہی نغمہ ہے کہ جس کو روح سنے
اور روح سنائے"

اس سفر میں تجربہ کار و باعمل نوجوان، حوصلہ مند اور جواں ہمت بزرگ، دردمند اور باشعور رہنما، سرفروش و سادہ دل عوام، لیکن اسی کے ساتھ مختلف جگہوں پر پھیلے ہوئے دام تزویر اور زمین دوز کمین گاہیں اور بارودی سرنگیں بھی نظر آئیں جو سوسائٹی کے مختلف طبقوں میں بچھائی گئی تھیں۔ پھیلائے ہوئے زہر کے باقی ماندہ اثرات اور صوبائی، لسانی اور قبائلی تعصبات کے بوجھ محسوس کئے۔ ایمان و اخلاص کے دلنواز جھونکے بھی فضا کو کبھی کبھی معطر کرتے ہوئے اور سنجیدگی و شعور کی کچھ لہریں بھی سطح آب سے ابھرتی ہوئی دیکھیں۔ مسجدیں "شکستہ رشتۂ تسبیح شیخ" اور بت کدہ میں برہمن کی "پختہ زناری" بھی دیکھی، امیدوں کے شعلہ افروز چراغ اور باد مخالف کے تند و تیز تھپیڑے بھی دیکھے۔ زندگی و زندہ دلی بھی دیکھی، حیوانیت و درندگی بھی۔ ہمدردی و انسانیت بھی، اور خودغرضی و نفسانیت بھی، اسلامیت و مغربیت اور پالیسی اور بیوروکریسی کی سخت کشمکش اور معاشرہ کا فساد اور ماحول کا بگاڑ بھی، اور مردِ درویش کے "انداز خسروانہ" بھی، جس کو ایک ترجمان حقیقت نے ان بلیغ انداز میں ادا کیا ہے ؎

کرم ترا کہ بے جوہر نہیں میں
غلام طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن
کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

ہمارا قیام اس عزیز و قریب ملک میں ایک ماہ کے قریب رہا، عم مخدوم و معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی قیادت میں اس مختصر قافلہ نے جس میں راقم سطور کے علاوہ مخدومی مولانا محمد معین اللہ ندوی، نائب ناظم ندوۃ العلماء اور رفیق محترم مولانا اسحاق جلیس ندوی ایڈیٹر "تعمیر حیات" شامل تھے۔ اختتام کانفرنس پر ملک کا ایک دورہ کیا۔ ہر طبقۂ خیال اور مکتب فکر سے ملے۔ ہر سطح پر گفتگو، خطاب اور مشورہ کی نوبت آئی جس دلچسپی، اشتیاق اور آرزو و جستجو کے ملے جلے جذبات کے ساتھ یہ باتیں سنی گئیں اور انہوں نے ان نازک لمحات میں جو اہم اور تاریخی کردار ادا کیا، اس کی کہانی سنانا یہاں مقصود نہیں اور نہ ان اثرات کو کسی پیمانہ یا بیرومیٹر سے ناپا جا سکتا ہے۔ اس مجلس میں مجھے جس بات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ وہ امیدیں اور اندیشے کیا ہیں اور کس نوعیت کے ہیں، جس کے بالکل وسط میں یہ ملک آج نظر آ رہا ہے۔ نیز یہ کہ ان اندیشوں اور ان خطرات کو جو اس کے سر پر منڈلا رہے ہیں۔ کس طرح دور کیا جا سکتا ہے۔

مختصر الفاظ میں اگر ہم اس کو بیان کرنا چاہیں تو اس کو ان الفاظ میں ادا کر سکتے ہیں کہ یہ امیدیں ہیں اس ملک میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی۔ اور اندیشے ہیں نام نہاد جمہوریت کے بلند بانگ دعوؤں اور انتخابات کے مسلسل مطالبوں کے۔

نظام مصطفیٰ کی ان امیدوں کے ساتھ جمہوریت کے پُر فریب و سحرانگیز نعرے اور الیکشن کے بلند بانگ مطالبے آج ملک کی توانائی اور مستقبل کے لئے سب سے بڑا حقیقی خطرہ اور سنگین چیلنج ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہوگی کہ طویل عرصہ کے بعد ایک مخلصانہ اور سنجیدہ قیادت ملک میں سامنے آئی ہے۔ اور اس وقت زمام اختیار اس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ قیادت مخلص بھی معلوم ہوتی ہے، بااختیار بھی، متحمل اور باوقار بھی، اس کے اندر دینی جذبہ، اسلام اور مسلمانوں کے لئے کچھ کرنے کا عزم و حوصلہ اور سیاسی شعور بھی

نظر آتا ہے اور اس کی صفوں میں اتحاد بھی، عسکری قوت کی پشت پناہی اور عوام کے ایک بڑے طبقے کی دلی ہمدردی اور اخلاقی حمایت بھی جو آسانی کے ساتھ عملی حمایت میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

اس قیادت کے اردگرد جو لوگ ہیں ان کے متعلق بھی کوئی تشویشناک بات نہیں سنی گئی بلکہ ان میں سے متعدد لوگوں کے بارہ میں اچھی خبریں ملیں۔ عملی سیاست اور واقعات کی دنیا میں بھی اس کی تصدیق ہوئی۔ اس قیادت نے علماء و مشائخ، جدید تعلیم یافتہ طبقہ، اسلامی جماعتوں اور ملک اور بیرون ملک کے سنجیدہ، ذی شعور و باحمیت افراد کی طرف جس کھلے دل اور جس حوصلہ اور عالی ظرفی کے ساتھ ہاتھ بڑھایا اس نے اس کے اعتماد کو بڑھایا ہے۔

مختصر الفاظ میں پاکستان جیسے بدقسمت ملک کو جس کو ۳۰ برس میں کوئی ایک وقت سے "باصلاحیت و باصلاح" شخص (جسکو قرآن مجید میں "اولی الأیدی والابصار" یعنی دست و بازو کی قوت رکھنے والے اور نگاہ بصیرت کے حامل، کے نام سے یاد کیا گیا ہے) نہ مل سکا تھا۔ ایک ایسا رہبر و قائد ملا ہے جس میں کچھ ایسی شرطیں پائی جاتی ہیں۔ یہ مجموعی صورت حال کا سب سے روشن اور خوش آیند پہلو ہے۔

اس قیادت نے تدریجی عمل اور احتیاط و توازن سے زیادہ سے زیادہ ہمدردی حاصل کرنے اور اسلامی دستور اور نظام حیات کی طرف میانہ روی لیکن ثابت قدمی اور مضبوطی کے ساتھ مسلسل پیشقدمی کا رویہ اختیار کیا ہے اور جن خطوط اور جس انداز پر موجودہ قومی حکومت کی تشکیل کی ہے۔ اس سے اسکے بارہ میں کوئی غلط تاثر قائم نہیں ہوتا بلکہ کچھ اچھی ہی امید بندھتی ہے۔

مشرق اسلامیہ کے مشہور مفکر سید جمال الدین افغانی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "مشرق کے لئے سب سے زیادہ موزوں قائد" مستبد عادل" (یعنی منصف و عادل ڈکٹیٹر) ہو سکتا ہے "۔ یہ بات اپنے پورے سیاق و سباق میں صحیح ہو یا نہ ہو۔ اس ملک کے نئے حالات میں اس کو ضرور ایک اہمیت ہے۔

اس سے زیادہ صراحت سے کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں طویل عرصہ بعد ایک ایسا حکمراں برسر اقتدار ہے جو اسلام کا صرف نام نہیں لیتا بلکہ اسلامی نظام کی کھل کر تبلیغ کرتا ہے۔ اس کی ذاتی و عملی زندگی ان دعوؤں کے منافی نہیں ہے، اس کا سیاسی طرز عمل بھی اس کی نفی نہیں کرتا۔ اس پر زیادہ سے زیادہ بعض حلقوں سے سست روی و کمزوری کا الزام لگایا گیا ہے۔ لیکن ایک ایسے معاشرہ کی، جس کو ۳۰ سال تک بالخصوص گزشتہ سات سال کے عرصہ میں دل کھول کر بگاڑا گیا۔ تاخت و تاراج کیا گیا۔ اور لوٹا گیا چند روز میں کوئی قلب ماہیت نہیں ہو سکتی۔ اور اگر عاجلانہ اور فوری کارروائی کی گئی تو اس کے نتائج اطمینان بخش اور دیرپا ہرگز نہیں ہو سکتے۔

اندیشہ سب سے بڑا جمہوریت کے ان دعویداروں کی طرف سے ہے جو اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے اس نام کا غلط استعمال کر رہے ہیں یا جو اپنی سادگی میں جمہوریت کو ہر مرض کی دوا اور ہر درد کا درماں سمجھتے ہیں۔ بدقسمتی سے مغرب کی بالادستی نے ہمارے ذہنوں کو اس قدر مفلوج اور معذور کر دیا ہے کہ اس سے ہٹ کر ہم کوئی چیز سوچنے کے قابل نہیں رہے۔

آج جمہوریت ایک ایسا کھوکھلا نعرہ ہے جس کو اس کے متوقع نقصانات اور مفاسد کے باوجود لگانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ غرض مند اپنی مقصد برآری کے لئے، بہت سے لوگ اس کے مفاسد اور نقصانات سے ناواقفیت کی بنا پر، بہت سے مغرب کی ذہنی غلامی کے اثر سے یا اخلاقی جرأت کے فقدان سے یہ نعرہ لگانے پر، اس کا کلمہ پڑھنے پر یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کی مالا جپنے پر مجبور ہیں۔ گویا پرائے شگون میں اپنی ناک کٹوائی جا رہی ہے۔

یہاں مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب کا وہ واقعہ یاد آ رہا ہے کہ جب ان کے انتقال کا وقت قریب ہوا تو ان کے احسانات کے پیش نظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان کے بالکل قریب جا کر آہستہ سے فرمایا کہ چچا! آپ میرے کان میں چپکے سے کلمۂ شہادت پڑھ لیں۔ تاکہ کل آخرت کے روز میں اس کا گواہ بن سکوں۔ انہوں نے اس کا جو جواب دیا اس میں ہمارے لئے عبرت کا بڑا سامان ہے۔ انہوں نے کہا بھتیجے! میں تمہارا کہنا ضرور مان لیتا مگر مجھے ڈر ہے کہ میری قوم یہ کہے گی کہ ابوطالب نے بھتیجے کے کہنے سے اپنا دین تبدیل کر دیا۔ چنانچہ وہ اس دولت ایمان سے خالی ہاتھ دنیا سے گئے۔

آج اگر کچھ لوگ ان نازک و قیمتی گھڑیوں میں بھی (جس میں بعض وقت صدیوں کے لئے ملکوں اور قوموں کی قسمت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اور جس کو موت و زیست کی کشمکش سے بھی ہم تعبیر کر سکتے ہیں) محض اس ڈر سے کہ اس فضا میں یہ بات کہنا مشکل ہے۔ اور اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ سمجھنے کے باوجود کہ اس وقت جمہوریت اور الیکشن کے نام پر ملک کو کسی انتشار میں مبتلا کرنا اس کے ساتھ دشمنی کرنا ہے محض اس ڈر سے کہ سیاسی جماعتوں کے بعض رہنما ناراض ہوں گے، یا مغربی حلقے اور ہمارے بدخواہ اس کو کس نظر سے دیکھیں گے، یا چند ناکام سیاستداں اس پر کس قدر چراغ پا ہوں گے، ملک کی تقدیر اور آئندہ نسلوں کے مستقبل کے ساتھ دیدہ و دانستہ کھیلتے ہیں، تو وہ نہ اپنے ساتھ خیرخواہی کر رہے ہیں نہ اس ملک کے ساتھ جس کشتی میں وہ خود بھی سوار ہیں، نہ اسلام کے ساتھ جس کے ساتھ ان کی قسمت ہمیشہ کے لئے وابستہ کر دی گئی ہے، خاص طور پر وہ طبقے جو صدق دل سے یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک میں صحیح اسلامی نظام اور امن و امان قائم ہو، جہاں ایمان کی باد بہاری چلے، زندگی کا حقیقی لطف آئے، آپس میں اتحاد و محبت ہو، ملک ترقی کرے، اور دوسروں کے سامنے ایک مثالی نمونہ پیش کر سکے، جو چاہتے ہیں کہ یہاں حدود اللہ کا اجراء ہو، خدا کا بنایا ہوا قانون نافذ ہو، بدی و فواحش کی راہیں مسدود ہوں اور "یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم" کا ظہور ہو، کم از کم ان سے ہمیں بجا طور پر یہ توقع ہے کہ وہ صورت حال کی نزاکت کو محسوس کریں گے اور یہ سمجھیں گے کہ اگر ان کے یہ مطالبات اور تقاضے موجودہ حکومت سے کسی درجہ میں بھی پورے ہو رہے ہیں یا کم از کم ان کی امید پیدا ہو چلی ہے تو ان کے خلوص و صداقت، دینداری اور دیانت اور ملک و قوم سے سچی ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ صف آرائی کے بجائے اخلاقی حمایت اور ہمدردی و تعاون کا رویہ اپنائیں۔

پاکستان میں اسلام کے احیاء اور اسلامی انقلاب اور معاشرہ کی تشکیل جدید کا یہ عظیم کام جس کو مقصد اور منزل قرار دیا

گیا ہے اتنا اہم اور نازک کام ہے کہ اس میں ادنیٰ درجہ کی ناکامی اور بدنامی کے اثرات پورے عالم اسلام تک پہونچیں گے اور اس کا داغ آسانی سے مٹایا نہ جا سکے گا، اور اس کا الزام ان ہی پر لگایا جائے گا جو آج ان موہوم اندیشوں میں کہ انتخاب کے اس چلے ہوئے نعرے کی اس علم و فن اور حریت فکر و رائے کے زمانہ میں مخالفت کیسے ممکن ہے؟ اس خطرناک آواز میں اپنی آواز ملا رہے ہیں جو اس وقت اس ملک کے لیے نہایت ناموزوں بلکہ مہلک اور سمّ قاتل ہے۔

ہمارا مقصود اسلام ہے، کتاب و سنت کی بنیادوں پر زندگی اور معاشرے کی تشکیل جدید ہے اور اس مادہ پرست اور مغرب زدہ دنیا کے مقابلہ میں اسلام کی حقانیت و برتری کا نقش جمیل قائم کرنا ہے مقصود انتخاب اور الیکشن نہیں، اگر انتخاب کے بغیر یہ مقصد پورا ہوتا نظر آتا ہے اور انتخاب کے بعد اس کے امکانات کم اور انتشار و کشمکش کے امکانات زیادہ نظر آتے ہیں تو جمہوریت کے جھوٹے تقدس کی خاطر اس قومی و عمومی خودکشی کی طرف بڑھنا عقل کی بات نہیں۔

اگر مغربی فلسفوں نے مغرب زدہ مفکروں نے "ترقی پسند" دانشوروں نے اور ان غلام، اسیر اور پابہ زنجیر ذہنوں نے جو یورپ کی بنائی ہوئی سرحد سے آگے بڑھنے، اور اس کی پست سطح سے بلند ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے الیکشن کے اندر کچھ تقدس پیدا کر دیا ہے تو خدا کے ان آزاد بندوں کا جو اپنے دل و دماغ کے مالک ہیں اور اپنا بھلا اور برا سمجھنے کی تمیز اور اچھے کو اچھا اور برے کو برا کہنے کا حوصلہ اور ہمت رکھتے ہیں کا یہ فرض ہے کہ وہ آگے بڑھ کر اس کشتی کو جو منجدھار میں ہے بچانے کی کوشش کریں اور یہ سمجھیں کہ یہ کشتی ڈوبی تو سب کو لے کر ڈوبے گی اور خطرہ ہے کہ اس کی ذمہ داری اس طبقہ کے سر نہ آئے جو اسلام کا سب سے زیادہ نام لیتا ہے اور اس کے ساتھ منسوب ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیوا اور آپ کے عشق و محبت کا دعویدار ہے ؎

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و ملا کی ناخوش اندیشی

ان لوگوں سے بھی جو ہر بات کو علم اور عقل کی ترازو میں تولتے ہیں، اور اپنے کو عقل کل سمجھتے ہیں۔ ان دانشوروں سے جن کو اپنی حقیقت پسندی اور واقعہ نگاری پر بڑا ناز ہے۔ ان طلبہ سے جن کا گرم لہو ان کو اکثر ہنگامہ آرائی پر اکساتا ہے، ہماری مودبانہ گزارش ہے کہ وہ بھی اپنے موقف کا از سر نو جائزہ لیں، اور سمجھیں کہ وقت کا تقاضہ اور تاریخ کا فرمان کیا ہے!

آخر میں ایک اور حقیقت کی طرف توجہ دلا کر یہ گذارش ختم کرنی ہے اور وہ یہ کہ اسلامی قوانین اور حدود شرعیہ میں بجائے خود ایک طاقت موجود ہے، ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی تاثیر ودیعت فرمائی ہے کہ معمولی کوتاہیوں اور لغزشوں کے ساتھ بھی اس کے حیرت انگیز، حیات بخش اور انقلاب آفریں اثرات ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ شرط صرف اخلاص کی اور حالات پر نظر رکھتے ہوئے حکمت اور قوت کے ساتھ ان کو نافذ کرنے کی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے بگڑے ہوئے معاشرہ کی بنیادی اور ضروری اصلاح کے ساتھ جس قدر جلد ممکن ہو سکے ان بعض قوانین کا اجرا عمل میں لایا جائے جن کے اثرات جلد نظر آئیں۔ اور ہمہ گیر ہوں، اور جن سے ان مفاسد و مشکلات کا دروازہ بند ہو جن سے پاکستان کے عوام خود نالاں اور زار و زار ہیں۔

فحش رسالے، گندی تصویریں، مخرب اخلاق ادب و لٹریچر اور وہ آوارگی و فحاشی جو فن کے نام پر سینما، تھیٹر یا لٹریچر کے ذریعہ پھیل رہی ہے، سخت پابندی کی محتاج ہے۔ مجھے اس سفر میں بعض ایسے رسالے نظر آئے جن کے باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں۔ ان میں ایک رسالہ "احساسات"، کا جو ترقی پسندوں کو بھی بدنام کرتا ہے بے تکلف نام لیا جا سکتا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس طرح کے رسالوں فلموں، تصویروں، اور کتابوں پر پابندی سے (جو کھل کر اور بدمذاقی کے ساتھ اور کبھی چابک دستی اور ہنرمندی سے بھی، اسلام کی جڑیں اکھاڑنے کی پیہم کوشش میں مصروف اور نوجوانوں کے ذہنوں کو آوارہ و فاسد بنانے کے لئے سرگرم عمل ہیں) عوام میں کوئی ناموافق ردعمل ظاہر ہوگا۔

حدود شرعیہ کے اجراء اور احکام الٰہی کی تنفیذ کے مسئلہ میں ہمارے ذہنوں کے اندر ایک انجانا خوف ہے اور وہ خوف اسلامی نظام سے دوری اور طویل عرصے سے محرومی کا نتیجہ ہے۔

یہ عمل PROCESS یعنی بیک وقت اصلاح معاشرہ کا کام جس کا آغاز ذرائع ابلاغ اور ذرائع معیشت سے ہونا چاہیئے اور سوچ سمجھ کر اسلامی قوانین اور ان حدود شرعیہ کا اجراء جن سے لوگوں کو سکون و اطمینان کی دولت حاصل ہو۔ اور ان کا یقین اسلام کی حقانیت اور افادیت پر پہلے سے بڑھ جائے۔ ہمارے قدموں کو انشاء اللہ استحکام بخشے گا۔ اور اگر اس طرح کے دو ایک اقدامات کر لیے گئے تو اس سے قیادت کو نیا اعتماد و حوصلہ اور عوام کو نیا جوش و ولولہ ملے گا۔

یہ سطور اسلام کے رشتہ سے لکھی جا رہی ہیں۔ اور دراصل اس کے مخاطب صرف اہل پاکستان نہیں (اگرچہ سردست ہمارا روئے سخن ان ہی کی طرف ہے)۔ اس کا مخاطب اصلاً ہر مسلمان ہے۔ یہ پورے عالم اسلام کا مسئلہ ہے، یہ اسلام کی بازیافت اور بازگشت کا سوال ہے۔ اس کا تعلق ایک لحاظ سے پوری انسانیت عامہ سے ہے۔ جو موجودہ مسلمانوں کی کوتاہیوں کی وجہ سے زندہ اور حقیقی اسلام کے اس نظارہ سے محروم ہے۔ جس کو دیکھ کر گذشتہ صدیوں میں متعدد قومیں مسلمان ہو گئیں، یہ نہ صرف تنہا صلاح و تقویٰ، خداپرستی اور ایمان داری کا مسئلہ ہے۔ نہ تنہا اسلامی قانون کی عملداری اور اسلام کی تاجداری کا۔

بیسویں صدی کی اس

(بقیہ صفحہ پر)

مسلمان ہر محاذ پر ناکام کیوں؟

از ڈاکٹر محمد اشتیاق قریشی ——— (صدر کل ہند انجمن ہلال احمر)

مسلمان دانشور، علماء، ادیب اور شاعر تقریباً سبھی اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس کا اظہار کرتے ہیں کہ مسلمان اتنی بڑی تعداد کے باوجود غریب کمزور اور غیر موثر ہیں۔ اس کے اسباب کی نشاندہی بھی ہوتی ہے علماء خصوصیت سے اس کی وجہ مسلمانوں کی بے دینی اور خدا سے بے تعلقی کو قرار دیتے ہیں سیاسی لوگ اقتصادی بدحالی کو اہمیت دیتے ہیں اور سیاسی شعور کی کمی کو اصل سمجھتے ہیں۔ کوئی اعداد و شمار کی بنیاد پر مسلمانوں کے مسائل کا حل تجویز کرتا ہے۔ لیکن ایمانداری سے دیکھا جائے کیا وہ لوگ جو ملت کو سرخرو و سربلند دیکھنے کے لئے بے چین ہیں جو پرجوش تقریروں سے پورے علاقہ کو گرما دیتے ہیں عملی زندگی میں اتنے ہی بے نفس، فکرمند اور عملی ہیں۔ کیا سیاسی رہنمائی کرنے والے اقتدار کی ہوس سے بے پرواہ خود آپس میں ایک صوبہ ایک علاقہ اور ایک ملک میں پوری طرح متحد ہیں کیا علماء پوری طرح متحد و متفق ہیں۔ کیا کسی عملی پروگرام میں ادیب، شاعر اور دانشور پوری طرح ہم خیال اور ساتھ ہیں مبالغہ نہ ہو تو اس کا جواب بڑی حد تک نفی میں ہوگا۔ ایسا نہیں ہے کہ تصنیف و تالیف کا کام نہیں ہو رہا ہے، ادارے نہیں چل رہے ہیں، سوشل کام نہیں ہو رہا ہے الیکشن کی سرگرمیاں نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ ہے لیکن سب جانتے ہیں کہ آپس میں تفریق ہے بغض ہے، عناد ہے، نفاق ہے ہر کوشش اور ہر جد و جہد کسی مرحلے پر فیل ہو رہی ہے۔ کسی بڑے سے بڑے کارخانہ میں جہاں ہر طرح کی اعلیٰ مشینیں اور سارے لوازمات ہوں لیکن ان کو آپس میں مربوط کرنے والی چیز نہ ہو تو اچھے معیاری پروڈکشن کی امید تو درکنار سرے سے کسی خیر کی امید ہی نہیں کی جا سکتی۔

مسلمانوں کے حالات کو بہتر اور موثر بنانے کے لئے بار بار نئی نئی انجمنیں اور تنظیمیں وجود میں آئیں لیکن چند روز میں اُن کا جوش و خروش اور ان کی سرگرمی ٹھنڈی ہو گئی اور یہاں تک ہوا کہ آپس ہی میں دست بہ گریباں ہو گئے۔

یہ سب کیوں؟ یہ ایک سوال ہے۔

یہ سوال ہر صاحب ضمیر، سنجیدہ اور مخلص آدمی کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس سے جواب چاہتا ہے۔ آخر کب اس کا جواب ملے گا؟

مسلمان عوام کب تک اندھیرے میں بھٹکتے رہیں گے۔ کب تک اُن کا استحصال ہوتا رہے گا۔ اور کب تک وہ ذلت کی زندگی گذاریں گے۔

جو باتیں خارجی طور پر سمجھ میں آتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

۱۔ عمومی دینداری کی کمی
۲۔ مخلص اور بے نفس قیادت سے محرومی۔

اس پر عام طور پر اتفاق ہے کہ مسلم عوام سے جب بھی قربانی کے لئے کہا جاتا ہے وہ بے جھجک قربانی دیتے ہیں۔ لیکن خواص اور رہنماؤں کا طبقہ بعض اہم ترین موقعوں پر اس معیار پر پورا نہیں اترتا۔ یا تو وہ اپنی قیادت کی قیمت وصول کرنے میں لگ جاتا ہے یا پھر اقتدار کی جنگ میں اُلجھ جاتا ہے۔ ایسا بارہا ہوا کہ جب یقینی کامیابی کی منزل قریب آئی ہماری آپس کی کشمکش نے نہ صرف منزل پر پہونچنے سے محروم کر دیا بلکہ محرومی اور ذلت کے سراب زدہ صحرا میں پہونچا دیا۔ ایسا بھی اکثر ہوا ہے کہ جب کسی کام کے کامیاب نتائج ظاہر ہونے کی امید پیدا ہوئی تو ہوا پرستوں اور نفس پرستوں میں ڈوبے ہوئے کچھ لوگوں نے پورے کام کا قلع قمع کر دیا گیا۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ اُن اخباروں اور رسالوں کی اشاعت اور مقبولیت زیادہ ہے جو دراصل مسلمانوں کے مقاصد اور اصل مفاد سے بہت دور ہیں وہ اخبار اور رسالے جو فکری رہنمائی اور قیادت کا فرض انجام دیتے ہیں ان کی اشاعت بے حد محدود ہے اور کہیں کہیں وہ موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہے۔

ایسی صورت میں یہ بات روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ جب تک پورے ملک میں فکری و سیاسی سطح پر ایک قیادت نہیں ہوتی الگ یونٹوں خواہ علاقائی ہوں یا گروہی، برادریاں ہوں یا ذاتیں اگر ایک ملی قیادت میں ضم نہیں ہو جاتیں اور ہم اتنی قربانی بھی نہیں دے سکتے تو شور مچانے اور رنج و الم کے آنسو بہانے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی ہے کہ جب اس سے براہ راست تعلق رکھا جاتا ہے اور چند مخلصین کی قیادت یا کسی ایک شخص کی رہنمائی پر اتفاق کر لیا جاتا ہے تو خدا کی مدد ضرور آتی ہے۔

شوریٰ کا تصور نہ علاقائیت کا پابند ہے نہ ذات و برادری کا نہ وہ نام نہاد جمہوریت کا پرتو ہے اور نہ زبان و رنگ و نسل کا مسئلہ بالکل صاف اور کھلا ہوا ہے۔

پہلے کسی ایک کی قیادت اور رہنمائی تسلیم کی جائے پھر اس کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنی شوریٰ یا کونسل خود نامزد کرے اور وہی پوری مسلم قوم کی قیادت و رہنمائی کی ذمہ دار ہو۔

اگر کسی بڑے سے بڑے ملک یا چھوٹے سے چھوٹے ملک میں یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو ملت ایک روز میں اتنی طاقتور اور موثر ہو جائے گی کہ کوئی اسے نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

بقیہ صفحہ ۱: پاکستان - امیدیں اور اندیشے

دنیا میں جو اسلامی انقلاب رونما ہوگا وہ ایمان و تقویٰ، علم و صلاحیت کار، اور برتر و بہتر قانون سازی کے ذریعہ ہی ہوگا لیکن خدا اور اس کے رسول سے سچا تعلق، خدا کا خوف، ایمان و تقویٰ کی روح اسلام اور مسلمانوں سے سچی محبت، مادیت کی کچلی ہوئی اور مغرب کے زہر سے سسکتی ہوئی انسانیت کی چارہ سازی و مسیحائی کا جذبہ اس اسلامی انقلاب کا پہلا سبق اور الف ب ہے۔

پاکستان کے مخلص، سادہ دل اور باہمت عوام میں بہت سے ذخائر پوشیدہ ہیں اور اب وقت آگیا ہے کہ احیاء اسلام کے عظیم مقصد، انسانیت کی فلاح و بہبود اور امن عامہ کے لیے اور اس پورے علاقہ میں ہدایت کے بند دروازے کھولنے اور خدا کی رحمت کو متوجہ کرنے کے لیے جو گھنگھور گھٹا کی طرح برسنے کے لیے تلی کھڑی ہے۔ اپنے مفاد اور اغراض و خواہشات اور ذاتی و جماعتی سربلندی کی کچھ قربانی دی جائے۔

یہ پیاسی سرزمین آج ایک بار پھر قربانی چاہتی ہے، لہو کی قربانی نہیں نفس اور نفسانی خواہشات کی قربانی، سوسائٹی کی سطح پر ہوس اقتدار اور شوق انتخاب کی قربانی، جماعتی سطح پر مطلق العنانی، انانیت اور خود پسندی کی قربانی، قیادت و حکومت کی سطح پر۔ کیا آج ہم خالص خدا کی رضا کو سامنے رکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی و مسرت، اسلام کی بقا و حفاظت اور سرسبزی اور سرخروئی کے لئے ہم یہ قربانی دے سکتے ہیں؟

مولانا رومؒ سے اقبالؒ کا انٹرویو

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب تعمیر حیات لکھنؤ

سلام مسنون!

"پیر رومی اور مرید ہندی" کا اردو نثر بہ شکل "مولانا رومؒ سے اقبالؒ کا انٹرویو" بھیج رہا ہوں۔ یہ انٹرویو اخلاقی اور معنوی حیثیت سے بہت مفید اور قابل قدر ہے۔ اگر مزید آگے بڑھ کر کہا جائے تو موجودہ دور کے اخلاقی بحران کا حل اس انٹرویو میں نظر آتا ہے۔ اقبال نے جس دنیا میں آنکھ کھولی اس کے اعتبار سے ہر موضوع پر کچھ نہ کچھ کہا ہے لیکن اس کے اصل پیغام کو ایک طبقہ نے جس کی ادبی دنیا پر گرفت ہے سامنے لانے میں بخل کا ثبوت دیا کیوں کہ یہ ان کے مفاد اور ماحول کے خلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے اس حقیقت کو پالیا تھا کہ انسان کی تعمیر صرف اخلاقی بنیاد پر ہو سکتی ہے اور سب سے مضبوط اور ٹھوس اخلاقی بنیاد اسلام ہی کے پاس ہے۔ اس لئے آج کی دنیا کو اسلام کی ضرورت ہے۔

امید کرتا ہوں آپ اسے قریب ہی کے شمارہ میں شریک اشاعت کرلیں گے۔ والسلام

محمد لئیق ندوی

آمنہ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز اینڈ انالائسس۔ کلکتہ

اقبالؒ: علم حاضر سے دین کی حالت زار و نزار ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

مولانا رومؒ: دراصل علم کی خوبی اور خرابی اس کے استعمال پر مبنی ہے۔ اس کا استعمال جسم پر کیا جائے گا تو اس کا لازمی نتیجہ تباہی اور ہلاکت ہے اگر اس کا استعمال دل پر کیا جائے تو بہترین ساتھی۔

اقبالؒ: مشرق و مغرب کے علوم پر میں نے کامل دسترس حاصل کرلی لیکن میری روح اب تک درد آشنا اور میرا دل اب تک مضطرب کیوں ہے؟

مولانا رومؒ: نا اہلوں کی تعلیم و تربیت نے تمہارے دل کو بیمار کر دیا ہے۔ تم میرے شفاخانہ میں چلے آؤ تمہارا بیمار دل شفایاب ہو جائے گا۔

اقبالؒ: مغربی تہذیب و تمدن کی چمک دمک نے مشرقی باشندوں کی نگاہ کو چکاچوند کر رہا ہے ان کی سحر زدہ نگاہوں میں فرنگی دوشیزائیں جنت کی حور سے زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ کیوں؟

مولانا رومؒ: ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوا کرتی اور ہر کھنکھناتی ہوئی شئے کھری نہیں ہوتی۔ دیکھنے میں پارہ کس قدر روشن ہے لیکن ہاتھ اور کپڑا دونوں اس سے سیاہ ہو جاتا ہے۔

اقبالؒ: قومیں کس آزار سے مر جاتی ہیں؟

مولانا رومؒ: ماضی میں جتنی قومیں فنا کے گھاٹ اتر چکیں اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ انھوں نے کھرے اور کھوٹے کے درمیان تمیز کرنے میں غلطی کی تھی۔ انھوں نے زہر کو امرت سمجھ لیا۔ فکر و نظر کی یہی بنیادی غلطی ان کے زوال کا سبب بنی۔

اقبالؒ: ملت کی حیات کس طرح محکم ہو سکتی ہے؟

مولانا رومؒ: ملت کی حیات ملت کے سربراہ خلوص اور قربانیوں ہی سے محکم ہو سکتی ہے۔ دنیا سے مکمل وابستگی اور دین سے ظاہرداری قوم کو تباہ کر دیتی ہے۔

اقبالؒ: اسلام کاروبار خسروی سکھاتا ہے یا راہبی؟

مولانا رومؒ: اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ اسلام جہاں بانی کے طور و طریقے سکھاتا ہے۔ زندگی کے بلند تر مقاصد کے لئے جہاد کو فرض قرار دیتا ہے۔

اقبالؒ: آدم کی حقیقت کیا ہے؟

مولانا رومؒ: اس کی ظاہری حقیقت صرف اتنی ہے کہ ایک مچھر اس کا کام تمام کر دیتا ہے۔ اس کا باطن یہ ہے کہ یہ وسیع و عریض کائنات اس کے سامنے ہیچ ہے۔

اقبالؒ: آدم کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟

مولانا رومؒ: رب کائنات کا دیدار آدم کی زندگی کا مقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو۔ یہی تصوف کا ماحصل اور خلاصۂ حیات ہے۔

اقبالؒ: علم و حکمت کی دولت کس طرح ہاتھ آسکتی ہے؟ زندگی میں سوز و ساز کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ آنکھیں کیسے پرنم ہو سکتی ہیں؟

مولانا رومؒ: کائنات کی حقیقت اور علم و حکمت حلال روزی سے حاصل ہوتی ہے عشق کا جذبہ حلال روزی ہی پیدا کر سکتی ہے۔

اقبالؒ: دین کے اسرار ہی سمجھ میں نہیں آتے تو قیامت کا یقین کیسے آئے؟

مولانا رومؒ: تم خود قیامت بن جاؤ پھر قیامت تمہارے نظروں کے سامنے ہوگی۔

اقبالؒ: آپ کہتے ہیں کہ دل تلاش کرو اور برسرپیکار رہو حالانکہ میرا دل میرے پہلو میں ہے۔

مولانا رومؒ: یہی بہت بڑی غلطی ہے کہ تم نے خود کو دل والا سمجھ لیا اور اہلِ دل کی جستجو چھوڑ دی۔

اقبالؒ: یورپ آج مادیت میں مست اور موسیقی میں غرق ہے۔ وہ بے مغزی، بے یقینی، بے ثباتی اور بے حضوری کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟

مولانا رومؒ: ہر چڑیا کی خوراک انجیر نہیں ہوتی۔ سماع کوئی ایسی ویسی چیز نہیں کہ ہر کس و ناکس اس سے شغل کیا کرے۔

اقبالؒ: وہ شخص جو دین کا راز دار اور رمز شناس ہے کیوں دنیا میں ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے؟

مولانا رومؒ: تم نے بھی عجیب بات کہی جس کی رفتار کے سامنے آسمان گرد ہو اس کے لئے زمین پر چلنا کون سی بڑی بات ہے۔

اقبالؒ: ایک طبقہ ایسا ہے جو کہتا ہے تقدیر پر ایمان نے انسان کو انحطاط میں مبتلا کر دیا ہے جبر و قدر کا فلسفہ تو آج تک میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔

مولانا رومؒ: یہ کوئی بہت بڑا اور پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے۔ اپنی اپنی فطرت پر منحصر ہے۔ پر باز کے ہوتے ہیں اور زاغ کے بھی لیکن ایک بلندی اور سلطانی کی راہ اختیار کرتا ہے جبکہ وہی پر زاغ کو پستی کی طرف لے جاتا ہے۔

اقبالؒ: جہاد کی حقیقت پر روشنی ڈالئے۔

مولانا رومؒ: جہاد کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ کائنات کے نقشوں پر ضرب مالکِ کائنات کے حکم سے لگاؤ۔ شیشہ پر ضرور پتھر مارو مگر یہ پتھر دوست کا ہی ہونا چاہیئے۔

اقبالؒ: کیا وجہ ہے کہ نئی نسل کا گرم اور جوان خون ساحران فرنگ کا بری طرح شکار ہے؟

مولانا رومؒ: چڑیا کا بچہ جب وقت سے پہلے اڑنے لگتا ہے تو چیر پھاڑ کر کھا جانے والی بلی کا شکار ہو جاتا ہے۔

اقبالؒ: میں ایک بے سر و سامان مرد فقیر ہوں لیکن میرا ہر تار نفس سلاطین کا ندیم بنا ہوا ہے۔

مولانا رومؒ: کسی ایک مرد روشن دل کے ہو کر رہ جاؤ یہ اس سے بہتر ہے کہ بادشاہوں کے چشم و ابرو پر بیٹھو۔

(بقیہ صفحہ ۱۳ پر)

چین نے عالمی سفارتی محاذ پر دھاوا بول دیا

اعلیٰ سطح کے رہنما دنیا کے چپہ چپہ کا دورہ کر رہے ہیں

عوامی جمہوریہ چین کے چیئرمین ہوا کوفینگ نے پچھلے ہفتے جب رومانیہ اور یوگوسلاویہ کا دورہ کیا تو چین کی خارجہ حکمت عملی کی ۲۹ سالہ تاریخ میں ایک نیا سنگ میل نصب ہوا۔ کیونکہ یہ پہلا موقع ہے کہ ایک چینی سربراہ نے ماسکو کے مغرب میں قدم رکھا ہے۔ بین الاقوامی حلقوں میں اس دورے کی اہمیت یہ ہے کہ چیئرمین ہوا نے دو ایسے ملکوں کو اپنی میزبانی کا شرف بخشا ہے جنھیں روس تیس برس سے بلا شرکت غیرے اپنی عملداری کا حصہ سمجھتا تھا۔ ماسکو میں ان کے اس دورے پر جس تشویش کا اظہار کیا گیا ہوگا اس کا بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے اور پھر جب چیئرمین ہوا نے واپسی میں ایران کو اپنے دورے کے پروگرام میں شامل کر لیا تو پیکنگ میں ایک مغربی سفارت کار بے ساختہ پکار اٹھا۔

خدا کی پناہ! اس ملک پر بالآخر یہ منکشف ہوگیا ہے کہ یہ ایک عالمی طاقت ہے اور اب اس کا رویہ بھی عالمی طاقت کا سا ہو گیا!"

چیئرمین ہوا اپنے اس تاریخی دورے پر سفر کرنے کو پیکنگ سے روانہ ہونے سے دو روز قبل ہی جاپان اور چین کے وزراء خارجہ نے امن اور دوستی کے معاہدے پر دستخط کرکے ماسکو کے اس احساس کو گہرا کر دیا کہ شمالی ایشیا میں سوویت یونین کی بالادستی کے دن ختم ہوگئے۔ اس معاہدے کی تجویز برسہا برس سے دونوں ملکوں کے زیر غور تھی لیکن سوویت یونین کی طرف سے اس کی برابر مخالفت کی جا رہی تھی چنانچہ معاہدے کے بعد بھی روسی خبر رساں ایجنسی تاس نے اس کو صاف الفاظ میں روس دشمنی پر محمول کرتے ہوئے کہا یہ معاہدہ امن و مصالحت کے منافی ہے اور سنگین خطرات سے پُر ہے اس سے روس اور جاپان کے تعلقات میں خرابی پیدا ہوگی۔ معاہدے کے متن میں بظاہر ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے روس کی مخالفت مقصود ہو۔ بلکہ اس کی دفعہ ۴ میں واضح کر دیا گیا ہے کہ یہ معاہدہ فریقین کے دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ البتہ دفعہ ۲ کی یہ عبارت غالباً روس کو بہت ناگوار گزری ہے کہ "فریقین ایشیا اور بحرالکاہل کے خطے میں یا کسی دوسرے علاقے میں اپنی بالادستی قائم کرنے کی کوشش نہیں کریں گے اور دونوں ہر اس ملک یا ممالک کی مخالفت کریں گے جو ایسی بالادستی قائم کرنے کی کوشش کرے۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چینی حکومت نے اس معاہدہ امن کو اپنی خارجہ پالیسی میں پے در پے دھماکوں کے اس سلسلے کی ایک کڑی بنایا ہے جس کا آغاز دراصل جون کے مہینے میں ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب افریقہ میں ایک طرف سوویت یونین اور کیوبا کی فوجی مداخلت بڑھتی جا رہی تھی تو دوسری طرف زائرے، چاڈ اور مغربی صحرا میں مقامی بغاوتوں کے مقابلے کے لئے فرانس اور بلجیم متعلقہ حکومتوں کی حمایت کرنے عملی اقدامات پر آمادہ ہو چکے تھے۔ اس دوران میں چینی وزیر خارجہ ہوانگ ہوا اچانک زائرے کے صدر موبوتو سے ملاقات کے لئے پہنچے انہوں نے خبردار کیا کہ غیر ملکی سامراج اپنے عالمگیر منصوبے کی تکمیل کے لئے زائرے کو بہت اہم سمجھتا ہے اس طرح وہ زائرے کی حکومت اور عوام کو چینی حمایت و اعانت کا یقین دلا کر ہالینڈ پہنچے جہاں انہوں نے وزیر اعظم اندریاس وان آگٹ اور ملکہ جولیانا سے ملاقات کی۔ اس موقع پر ولندیزی وزیر خارجہ نے ایک بیان میں جارحیت کے خلاف چین اور ہالینڈ کے تعاون کا اعلان کیا۔ ہالینڈ کے تین روزہ دورے کے بعد مسٹر ہوانگ ہوا انقرہ میں وارد ہوئے اور وزیر اعظم بلند ایجوت سے اہم مذاکرات کے بعد روانہ ہوتے وقت انہوں نے "افریقہ میں ایک بڑی طاقت کی کارروائیوں" پر شدید نکتہ چینی کی۔ ترکی سے فارغ ہو کر انہوں نے ایران کا دورہ کیا اور مشترکہ مفاد کے مسائل پر بات چیت کے دوران شاہ ایران کی اس ترجیح کو تسلیم کیا کہ عراق، افغانستان اور عدن میں روسی نفوذ کا مقابلہ کرنے میں چین ان کا ساتھ دے گا۔

وزیر خارجہ ہوانگ ہوا جن دنوں افریقہ، یورپ اور مغربی ایشیا کے دورے پر تھے انہی دنوں عوامی کانگریس کے نائب صدر جی پنگ فائی ایک وفد لے کر جنوبی امریکہ نکلے ہوئے تھے انہوں نے وینزویلا میں اعلان کیا کہ چین بھی ایک ترقی پذیر ملک ہے اور لاطینی امریکہ کی اقوام کی طرح تیسری دنیا کی برادری میں شامل ہے اس وفد نے ایک ہفتہ میکسیکو میں گزارا اور پھر کینیڈا کا دورہ کیا۔

جون کے اواخر میں نائب وزیر خارجہ [illegible] عرب ممالک کے ساتھ روابط کو مستحکم کرنے کی نیت سے عدن اور شام کے دورے پر نکلے ان کے بیانات کا بھی لب لباب یہ تھا کہ چین تیسری دنیا کا رکن ہے [illegible] کرتے ہیں انہوں نے اعلان کیا کہ ہم بھائیوں کی طرح ایک ہی مقصد اور ایک ہی جد و جہد میں منسلک ہیں۔

اسی اثناء میں نائب وزیر اعظم کینگ پیاؤ نے جنوبی ایشیا میں اپنے دیرینہ اتحادیوں پاکستان اور سری لنکا کا [illegible] کا دورہ کیا ان کے وفد میں اعلیٰ سطح کے فوجی، اقتصادی اور فنی ماہرین شامل تھے۔ پاکستان میں انہوں نے شاہراہ قراقرم کا افتتاح کیا اور جنرل ضیاء الحق سے نہایت دوستانہ ماحول میں مذاکرات کئے سری لنکا میں انہوں نے اس امر کی خاص طور سے نشاندہی کی کہ ناوابستگی کی تحریک میں یہ ملک قابل ستائش کردار ادا کر رہا ہے اس دورے کے اختتام پر مسٹر کینگ پیاؤ نے پیکنگ میں زیادہ دیر قیام نہیں کیا اور پھر کریبین کے ۱۵ روزہ دورے پر روانہ ہوگئے انہوں نے ٹرینیڈاڈ، جمیکا اور گیانا میں قیام کیا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہ ممالک کیوبا کے قریب ہیں جس کو چین سوویت یونین کا آلہ کار قرار دیتا ہے چنانچہ ان کے دورے پر کیوبا کے اخبارات میں چین کے خلاف جو تند و تیز اداریے شائع ہوئے ہیں وہ [illegible]۔

جولائی کے مہینے میں نائب وزیر اعظم مادام چن مو ہوا بھی افریقہ کے دورے پر روانہ ہوگئیں۔ مادام چن تیسری دنیا کے ممالک کے لئے امداد کے شعبے کی نگراں ہیں چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے صومالیہ میں ساڑھے پانچ سو میل لمبی سڑک کا افتتاح کیا یہ سڑک کسی غیر ملک میں چین کا سب سے بڑا تعمیراتی منصوبہ ہے صومالیہ سے گیبون ہوتی ہوئی وہ کیمرون پہنچیں۔ دونوں ممالک کے رہنماؤں نے "بڑی طاقتوں کی بالادستی، جارحیت اور سامراجیت" کی مذمت میں مادام چن کی آواز میں آواز ملائی آخر میں مادام چن نے سینیگال اور موریتانیا کا دورہ کیا۔

بین الاقوامی سطح پر چین کی سفارتی تگ و دو کا سلسلہ ابھی اختتام کو نہیں پہنچا ہے۔ آئندہ مہینوں میں ملائیشیا، سوڈان، مصر اور ترکی کے دوروں کے پروگرام مرتب کئے جا چکے ہیں ان سرگرمیوں نے جس قدر سوویت یونین میں تلملاہٹ پیدا کی ہے اسی قدر مغربی ممالک خصوصاً جنگ کے معاملہ میں یہ احساس [illegible] دراصل [illegible] درست ہے ان ملکوں کو چین کی پالیسی سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ سوویت یونین کو اپنی [illegible]

جمہوریہ چین کی موجودہ حکمت عملی [illegible]

جاپان اور چین نے امن اور دوستی کے معاہدے پر دستخط کرکے ماسکو کے اس احساس کو گہرا کر دیا کہ شمالی ایشیا میں سوویت یونین کی بالادستی کے دن ختم ہو گئے

[illegible]

چین کو یقین ہے کہ عالمی جنگ چھڑنے کے جرم کا ارتکاب روس کرے گا۔

عوامی جمہوریہ چین کی موجودہ خارجہ پالیسی تیسری عالمی جنگ کے دفاع کی حکمتوں پر مبنی ہے

(بقیہ صفحہ ۱۲ سے)

اقبالؒ: دین و وطن کی رسہ کشی کب تک چلتی رہے گی؟ آج تو روح پر بدن مقدم ہے۔

مولانا رومؒ: تاریک رات ہو یا روشن دن خانۂ دل میں ایک ہی تصویر ہے۔ وہ ہے نار اور زر گری۔

اقبالؒ: دل کس طرح بیدار ہوتا ہے؟

مولانا رومؒ: مقام بندگی کو سمجھنے اور بندہ بن کر رہنے سے۔ کارزار حیات میں تیز گام اور سبا رفتار بننے سے۔

اقبالؒ: زندگی کا بازار بے رونق کیوں ہو چکا ہے؟

مولانا رومؒ: اس لیے کہ یہاں عقلمندی فروخت کرکے حیرانی خریدنے والا کوئی نہیں۔ عقل انسان کو وہم و گمان دیتی ہے جبکہ حیرانی انسان کو بصارت و بصیرت سے نوازتی ہے۔

اقبالؒ: زمانہ کا تقاضا انجمن سازی ہے جب کہ سوز و گداز بغیر خلوت کے حاصل نہیں۔

مولانا رومؒ: خلوت اگرچہ بے بہا شئے ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنوں ہی سے کنارہ کشی اختیار کرلی جائے۔ مردوں کا کام روشنی حاصل کرنا اور روشنی و گرمی پھیلانا ہے پست نظر قوں کی بات چھوڑ دو ان کا کام ازل سے بہانہ سازی اور بے حیائی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد یہ پہلا رمضان ہے جس میں . . . . .

اس بار ماہ صیام آیا تو معاشرے کا رنگ ذرا سا بدلا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پہلے کے مقابلے میں شیطانوں کو زیادہ بھاری زنجیریں پہنائی گئی ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد یہ پہلا رمضان ہے جس میں کم سے کم لاہور کی حد تک (جہاں تک میرا مشاہدہ محدود ہے) بالعموم ایسا نہیں ہے کہ لوگ چلتے پھرتے سگریٹ پی رہے ہوں، یا پان کے دکانوں پر کوکا کولا اور سیون اپ سے شاد کام ہونے والوں کی قطاریں لگی ہوں یا چھوٹے بڑے ہوٹلوں، تنوری طعام خانوں اور اشیائے خوردنی و نوشیدنی بیچنے والے "فٹ پاتھیوں" نے چادریں تان رکھی ہوں اور ایسے مریضان عشق ہر جگہ ہجوم کئے ہوئے ہوں جو زبان حال سے ایک بہت پرانی مشہور گھٹیا سی غزل کا یہ مصرعہ الاپ رہے ہوں کہ "میں مریضِ عشق ہوں، میری دوا پردے میں ہو"۔ اب کے وہ پردے والے مریضان عشق بھی غائب ہیں، اور بنار بریں پردے بھی غائب! طعام اور شربت وغیرہ کی دکانیں کہیں تین چار بجے شام کو کھلتی ہیں۔ دوپہر یا قبل دوپہر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی نے پانی کی دکان سے فانٹا یا آرسی کی بوتل مانگی اور دکاندار نے انکار کر دیا۔

یہ تبدیلی اس حد تک صرف اس وجہ سے ہوئی ہے کہ مسجدوں میں خطبوں اور کتابی اور اخباری تحریروں کے ذریعے تو پہلے ہی احترام رمضان کی تلقین کی جاتی رہی ہے، اور بہت سے لوگ اسی تلقین کی وجہ سے رضا کارانہ طور پر احتیاط کرتے ہیں۔ مگر جب چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے ابتدائے رمضان کے وقت احترام رمضان کی اپیل کی اور اس کے لئے حکومت اور اس کے کارندے نیک نیتی اور مستعدی سے حرکت میں آ گئے ہیں تو پھر کیسے رمضان کے ساتھ وہ مذاق روا رکھا جا سکتا ہے جو ہمارے بڑے اور چھوٹے دنیا پرستوں اور شکم پرستوں نے روا رکھا ہے۔

دوسرا اچھا شگون یہ ہے کہ متذکرہ صورت حالات گواہی دیتی ہے کہ پاکستانی قوم جیسے بھی بڑے احوال سے دوچار چلی آ رہی ہے، اگر اس کی اصلاح صحیح طریقے سے کرنے کی کوشش کی جائے تو اسے ہر قسم کی پستیوں سے نکالا جا سکتا ہے۔

ہم اسی تصور کے تحت کام کر رہے ہیں کہ ایک طرف دعوت و تلقین اور تربیت و تزکیہ کا کام ہونا چاہیے، دوسری طرف حکومت کو اجتماعی پہلو سے جو حصہ کسی امر کے نفاذ یا انسداد کے لئے ادا کرنا لازم آتا ہے، وہ اسے کرنا چاہیے، اور پھر یہ یقین رکھنا چاہیے کہ یہ قوم خیر و فلاح ہی کی طرف پلٹے گی۔

(جناب نعیم صدیقی)

صدر قذافی اور احادیث نبویؐ

صدر قذافی نے حال ہی میں ایک تقریر لیبیا کی مسجد "مسجد مولائی محمد" میں صادر فرمائی، جس میں انہوں نے اس قضیے کو چھیڑا جس سے عرب ممالک کے مختلف جرائد اور اہل قلم اپنے اپنے طور پر تعرض کر رہے ہیں۔

صدر قذافی کی گفتگو کا مرکزی مضمون یا ماحصل یہ ہے کہ رسول کی سنت کی پیروی تو ضروری ہے لیکن احادیث کو یہ مقام حاصل نہیں۔ سنت ایک الگ چیز ہے، اور احادیث بالکل دوسری شے ہیں۔ سنت کی مثال یہ دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے ساتھ نماز صبح کی دو رکعتیں پڑھتے تھے، ظہر کی چار، مغرب کی تین (اسی طرح دوسری نمازیں) اس سے زائد اگر نماز میں کچھ اضافہ کرتے تو فرماتے کہ یہ بطور نفل ہیں۔ یہ تھا وہ علانیہ طریقہ جس کو مسلمانوں کے سامنے آپ نے عمل سے واضح کر دیا۔ پھر مسلمانوں کی نماز کا یہ طریقہ ایک زمانے سے دوسرے زمانے، اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقل ہوتا رہا۔ صدر قذافی کا قول یہ ہے کہ "یہ صورت ہے جس کے صحیح ہونے کا ہم یقین رکھتے ہیں، اور اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم یہ جان ہی نہ سکتے کہ قرآن میں نماز کا جو ذکر ہے، اس سے کیا مراد ہے"۔

صدر قذافی کا مدعا یہ ہے کہ سنت عملی شکل میں منتقل ہوئی ہے۔ رہا اُن اقوال اور بیانوں کا تعلق جو احادیث میں رسول خدا کے متعلق ہیں، اُن کو وہ غیر یقینی قرار دیتے ہیں۔ سنت کو، سنت کے ریکارڈ کے بغیر محض عمل سے پا لینے کا تصور بڑی پیچیدگیاں رکھتا ہے۔ . . . مثلاً سوچیے کہ

۱۔ حضور کے اعمال کا بصورت تقلید و اتباع جو انتقال بہ لحاظ زمان اور بہ لحاظ مکان یکے بعد دیگرے مختلف لوگوں تک ہوا ہے، خود ان کی شکلیں مسخ ہونے سے نہیں بچتیں۔ یہاں تک کہ تفصیلی طور پر نماز جیسی بنیادی اور روزمرہ کی عبادت کی ظاہری ہیئت میں بھی، اور پڑھے جانے والے کلمات میں بھی مختلف فرقوں کے درمیان بڑا اختلاف ہے۔ آج بے شمار مسلمان قبروں پر سجدہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بے شمار مسلمان تصوف کی مختلف اشکال کو لازمۂ اسلامیت سمجھتے ہیں، کوئی تفضیل علیؓ کو ایمان کا اساسی تقاضا قرار دیتا ہے، کوئی خارجیت کے انداز پر یزید کی مدح و ستائش کو واجب سمجھتا ہے۔

کیا ان اور ان جیسی مختلف عملی صورتوں کو آپ سنت قرار دیں گے، اگر نہیں تو سنت کو متعین کرنے کا کیا طریقہ ہوگا۔

کیا امت کے اعمال کی مختلف اشکال لازم نہیں کر دیں گی کہ سنت کا کوئی ریکارڈ تلاش کیا جائے اور اس کی چھان بین کی جائے؟

۲۔ مسئلہ صرف نماز روزے جیسی عبادت تک محدود نہیں ہے، اسلامی حکومت کے دستوری اصولوں اور ان کے عملی نفاذ کی مسنون صورتوں کا بھی ہے، معاش اور معاشرت کے تقاضا یا سنت کی راہوں کو متعین کرنے کا بھی ہے، جنگ و صلح اور حدود و تعزیرات اور دعوت و ارتداد اور جماعت کے تنظیم و تزکیہ کے متعلق بھی احکام خداوندی کی تفصیلی عملی اشکال کے فہم و شعور کا بھی ہے۔ یہ سب امت کے معمولات سے آپ کو کیسے مل سکے گا۔ مثلاً دنیا بھر کے مسلمانوں میں مطلق العنان بادشاہت کا بھی زور رہا ہے۔ پھر دور حاضر میں ان کے اندر سے جرنیلی آمریتیں بھی ابھری ہیں، علاوہ ازیں لادین جمہوری نظام اور اشتراکی ری پبلک کے ڈھانچے بھی نمودار ہوئے ہیں۔ آخر ان سب طریقوں کا شجرۂ نسب آپ خلافت راشدہ سے جوڑ کر حضورؐ کی سنت تک کیونکر پہنچائیں گے۔

اس طرح تو سارا دین الجھ کر رہ جائے گا اور شریعت کے احکام کو متعین صورت میں حالات پر سنت کے مطابق منطبق کرنا ممکن ہی نہ رہے گا۔

صدر قذافی ذرا سا بھی غور و فکر کریں تو وہ دیکھیں گے کہ اقبال یا شیکسپیئر یا غالب کو، یا کارل مارکس اور ابراہم لنکن کو یا امام غزالی اور مولانا رومی اور شیخ عبدالقادر گیلانی اور امام بخاری کی شخصیتوں کو سمجھنے کے لئے تو زندگی کے ادنیٰ ادنیٰ معاملات کے متعلق ان کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ کاغذ کا ایک پرزہ یا کسی واقعہ سے متعلق ایک سطر بھی بڑی کاوش سے تلاش کی جاتی ہے اور اس سے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں ——— حالانکہ ان میں سے کسی کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے "مطاع" (واجب الاطاعت) نہیں بنایا گیا، ان میں سے کسی کو سنت کو معیار فیصلہ نہیں ٹھہرایا گیا، اور ان میں سے کسی کو بے عیب اسوۂ حسنہ کا حامل نہیں گنا گیا۔ نبی اکرمؐ کا مقام تو ان میں سے کیا غیر مسلم، اور کیا مسلم، ہر ایک سے صد گونہ بلند تر ہے اور حضورؐ کو مقتدا، پیشوا، اسوہ، نمونہ اور معیار قرار دیا گیا ہے۔ پھر کیا ایسی عظیم شخصیت کی تجلیات کی عکاسی کرنے والا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے؟

صدر قذافی یہ مانتے ہیں کہ یہ ریکارڈ احادیث کے عنوان سے موجود ہے، مگر وہ کہتے ہیں کہ اس پر قرآن کی طرح یقین نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس کے متعلق شکوک و شبہات برقرار رہتے ہیں۔

اسی کے ساتھ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر آج رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے اور کوئی بات زبان سے ادا کرتے، ہم اسے لکھ لیتے تو بس سارا معاملہ ٹھیک تھا۔ ہم اس ریکارڈ کو اس بات کے علی الرغم قبول کرتے کہ ہماری گردنوں کے کٹ جانے کا خطرہ ہوتا۔

اب قذافی صاحب کے اس ارشاد پر ذرا سا غور کیجئے۔ اس میں یہ اعتراف موجود ہے کہ حضورؐ نے اگر کوئی بات فرمائی ہو اور اس کا یقینی علم (یا ظن غالب) حاصل ہو جائے تو اسے قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا لازم ہے۔

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر رسول برحقؐ کے کلام اور حضورؐ کے اعمال (جنہیں کسی نے دیکھا ہو) ایسی ہی اہمیت رکھتے ہیں اور دین و شریعت کا نظام ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تو پھر ان کے فرمودات کے مطابق آج کی امت محمدیہ کے ہاں تو سنت کے یقینی ریکارڈ کا خلا پایا جاتا ہے اور یہ خلا اگر ہے تو دین و شریعت کا سارا نظام ہی ادھورا ہو گیا۔ آخر آپ اس خلا کو کیسے پورا کریں گے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ حضور کے فرمودات اور معمولات یا بالفاظ دیگر سنت کے مختلف

پہلو اگر آپ کے مشاہدہ میں آ جاتے اور آپ ان کو لکھ لیتے تو کیا یہی سوال آپ کے بعد آنے والی نسلوں میں نہ پیدا ہو جاتا کہ قذافی صاحب کے دور میں اور ان کے بعد سنت کا جو ریکارڈ رکھا گیا اور جانچا، پرکھا گیا وہ ہماری نگاہوں میں مشکوک ہے۔ اگر ہم خود دیکھتے تو مان لیتے۔

اس سوال کو سامنے رکھیں تو پھر نتیجہ کے طور پر تیسرا سوال یہ نمودار ہوتا ہے کہ قول و فعلِ رسولؐ یا سنت رسولؐ کا جو ریکارڈ حضورؐ کے صحابہ اور ان کے شاگردوں نے رکھا، اور جسے محدثین نے جانچا، پرکھا اور جس پر دیانت دار فقہاء نے زندگی کے مختلف شعبوں کی تعمیرات استوار کیں، کیا اسے مشکوک قرار دینے کے یہی معنی نہیں نکلیں گے کہ صدر قذافی اور ان کے معاصرین کے مقابلے میں (نعوذ باللہ) حضور سے تربیت یافتہ صحابہ اور صحابہ کے شاگرد کم قابل اعتماد تھے؟

خیر ان سوالوں کو چھوڑیے، ذرا ایک اور زاویہ سے نظر ڈالیں۔ ایک عالم محمد سلیمان الاشقر نے بڑے دلچسپ انداز سے صدر قذافی کا ذہنی گھیراؤ کیا ہے۔ سلیمان پوچھتے ہیں کہ چلیے سنت و احادیث کی بحث کو تھوڑی دیر کے لئے درکنار رکھ کر ہمیں یہ بتائیے کہ جس قرآن کو آپ من جانب اللہ، قابل یقین بنائے قانون مانتے ہیں اور جس کی تعلیمات سے اختلاف کرنے کو کسی مسلمان کے لئے درست نہیں سمجھتے ہیں، اس کی یقینی تعلیمات منورہ سے سرشار ہو کر آخر آپ نے **ایتھوپیا میں صومالی مسلمانوں کے خلاف مخالف اسلام حکومت کو مدد کیسے دی۔ اور کیا یہ جائز کارنامہ ہے کہ آپ کے امدادی سامان اور مالی معاونت کا استعمال مسلمانوں کی خونریزی کے لئے ہوا۔** کیا آپ نے قرآن کا یہ حکم نہیں پڑھا تھا کہ یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء نیز لا تتخذوا الیہود والنصاریٰ اولیاء؟ آپ نے حدیثوں پر شک اور قرآن پر یقین و انحصار کر کے قرآنی مسلمانی کا یہ نمونہ کیا پیش فرمایا ہے؟ پھر سلیمان پوچھتے ہیں کہ یہ بھی فرمائیے کہ خود لیبیا میں کتنا کچھ نفاذ شریعت کا کام ہوا ہے؟

دراصل جناب سلیمان الاشقر کے ان نشتری الفاظ کے پردے میں بڑی اہم حقیقت جھلکتی ہے وہ یہ ہے کہ جہاں مخالف اسلام قوتوں اور نظریات اور تحریکوں اور ان کی پیدا کردہ ثقافت نے مسلمانوں پر پچھلی دو تین صدیوں سے یہ دباؤ ڈالا ہے کہ وہ احادیث کے مورچے چھوڑ دیں، خود مسلمانوں میں سے بھی جس کسی نے کوئی اوٹ پٹانگ حرکت اپنی شان مسلمانی کو برقرار رکھتے ہوئے کرنا چاہی ہے اس نے احادیث سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کے جتن ضرور کیے ہیں۔ مخالف اسلام تحریکوں اور رابطوں اور مفاد کے لئے جب کسی نے کام کرنا چاہا تو اس نے اگر پورے دین کا انکار کرنا مشکل پایا، تو کم از کم احادیث کے نشاناتِ راہ کو ملیامیٹ کرنے کی کوشش ضرور کی۔

قابل توجہ امر یہ بھی ہے کہ تارکین احادیث یا منکرین سنت نے خالص قرآنی دین کی علمبرداری کے بعد کسی بھی دور اور ملک میں اپنا جو کردار پیش کیا ہے وہ کبھی اسلامی کردار نہ تھا۔ ملحدانہ علوم و افکار اور مادہ پرستانہ تہذیب کی یورش میں یہ صرف شکست خوردہ مسلمان ہیں جو سرمایۂ احادیث کو بطور خراج اپنے فاتحین کے (نعوذ باللہ) قدموں میں رکھ دیتے ہیں، اور دور حاضر کے تخت کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہو کر عرض کرتے ہیں کہ ہماری توبہ، ہم باز آئے ان احادیث سے جو ہمیں آزادی فکر و عمل سے محروم کرتی ہیں، بس اب ہماری جان بخشی فرما دیجئے۔

اسی بیماری کا شاخسانہ صدر قذافی صاحب کی پیش کردہ وہ "سبز کتاب" ہے جسے وہ "نظریۂ ثالثہ" یا تیسرے راستے (THIRD WAY) کے طور پر پیش کرتے ہیں

سلیمان صاحب پوچھتے ہیں کہ جب آپ کے پاس اللہ کی نازل کردہ کتاب موجود ہے تو کیا وہ آپ کی سبز کتاب کی محتاج ہے اور وہ اس کے بغیر مکمل نہیں ہے؟ کل کوئی دوسرا شخص "زرد کتاب"، تیسرا "سرخ کتاب"، چوتھا "سفید کتاب" (وعلم جرا) پیش کر کے کہہ سکتا ہے کہ قرآن کو مانو اور اس کے ساتھ میری اس کتاب کو قبول کرو۔

ہر منکر حدیث فرد یا گروہ کی اصل بیماری یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ خیالات اور نظریات اصول اور ضابطے لوگوں پر مسلط کرنا چاہتا ہے مگر چونکہ احادیث (بہ حیثیت تشریح احکام قرآنی) اس کا راستہ روکتی ہیں، اس وجہ سے وہ اپنی جگہ مجبور ہوتا ہے کہ احادیث کو راستے سے ہٹائے، دوسرے لفظوں میں وہ نبیؐ کو مطاع اور شارع، معلم اور مزکی، اسوہ اور نمونہ اور وما ینطق عن الھویٰ ہونے کے منصب اعلیٰ سے ہٹا کر خود لپک کر اس مسند پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی تمام بحثوں کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ قرآن کو لے لو، باقی ضروریات کے لیے رسولؐ کی طرف رجوع کرنے کے بجائے میری طرف رجوع کرو، یا کوئی شخص کسی گروہ یا پارلیمنٹ یا حکومت کی طرف بھی اسی طرز پر بلا سکتا ہے۔

مگر قذافی صاحب یہ عقدہ حل کر دیں کہ رسولؐ تو معصوم ہوتا ہے۔ وہ اپنی ذاتی خواہشات اور نہ غیر متوازن رجحانات میں الجھتا ہے۔ لیکن کیا قذافی یا کسی دوسرے شخص یا گروہ کے متعلق ہم معصومیت کا ویسا تصور باندھ سکتے ہیں اور رسولؐ کی طرح کا اعتماد کر سکتے ہیں؟

منکرین حدیث کی ایک لازمی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ علماء کی نہ صرف مخالفت کرتے ہیں بلکہ تحقیر بھی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ چونکہ رسولؐ کی احادیث کے علم کے وارث اور محافظ ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے حدیث کے انکار کا مشغلہ تبھی جاری رہ سکتا ہے کہ گروہ علماء کے سر کچھ تاریخی جرائم تھوپے جائیں اور ان کو بے بصیرت بلکہ نالائق ثابت کیا جائے، اور موقع مل جائے تو ان کے خون سے ہاتھ رنگے جائیں۔

قذافی صاحب نے بھی اس فارمولے پر بڑی خوبی سے عمل کیا ہے۔

وہ علماء کے سر یہ قصور تھوپتے ہیں کہ یہ لوگ یورپ میں اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے والے ہیں (ورنہ آج یورپ، برطانیہ، امریکہ سب مسلمان ہوتے)۔ کیسے؟ وہ ایسے کہ ترکیہ کے مصطفیٰ کمال نے جب دین و دنیا میں تفریق کر کے اسلام کو آگے بڑھانا چاہا تو اس گروہ نے اس کی تکفیر کی جس کے نتیجے میں بے شمار مسلمانوں کے سر کٹ گئے۔

اب اگر صدر قذافی نے مصطفیٰ کمال کے شروع کردہ "کارنامہ تجدید و احیائے دین" کو از سر نو آگے بڑھانے کا بیڑا اٹھایا ہے تو یہی گروہ علماء اس کی سبز کتاب کو "اصح الکتاب بعد کتاب اللہ" تسلیم نہ کر کے دوبارہ وہی غلطی کریں گے اور دوبارہ خمیازہ بھگتیں گے۔ نیز ایک بار پھر یورپ میں فروغ اسلام کی مساعی برباد ہو جائیں گی۔

باقی ساری برکت و سلامتی ہے تو سوشلزم کے لیے، سیکولرازم کے لیے، ایتھوپیا کے متعصب اور جرنیلی عیسائیوں اور ان کی حمایت کرنے والے روسیوں اور کیوبائیوں کے لیے! اصل خادمان اسلام تو بس یہی رہ گئے ہیں۔ منکرین حدیث والی یہ بات بھی قذافی صاحب نے دہرا دی کہ احادیث میں سے جو بھی قرآن کے مطابق ہوگی، اسے ہم قبول کریں گے اور جو نہ ہوگی اسے ہم مسترد کر دیں گے۔

قرآن کی تشریح کے لیے احادیث ہیں، اور احادیث کو جانچنے کے لیے قرآن ہے، اور ماضی میں بے شمار علماء نے احادیث کی مفصل جانچ پرکھ کی ہے ان کے کام کو بالائے طاق رکھ کر قذافی صاحب "سمری ٹرائل" کے اسلوب سے صحت احادیث کا فیصلہ کریں گے۔ اور کوئی "ا" اور کوئی "ب" یا "ج" اپنی جگہ فیصلہ کرے گا کہ اسے کون سی حدیث قرآن کے مطابق نظر آئی ہے اور کونسی مخالف ——— یار لوگوں نے تو بات یہاں تک پہنچا دی ہے کہ اگر کسی حدیث میں قرآن کے "خاص" کو "عام" اور "عام" کو "خاص" کیا گیا ہو تو یہ بھی مخالفت و تعارض ہے۔ بلکہ قرآن نے نماز کے سلسلے میں اگر رکوع اور سجدہ اور دوسرے متفرق اجزائے نماز کا ذکر کیا ہے تو کوئی ایسی حدیث مطابق قرآن نہیں ہو سکتی جو ان اجزا کو ایک ایسی ترتیب سے جوڑ کر اور رکعتوں کی تعداد اور خاص خاص اوقات نماز متعین کر کے کہے کہ یوں ہو گی اقامت صلوٰۃ۔ قرآن کا منشا صرف یہ چاہا ہے کہ جب کسی کا جی چاہے صرف سجدہ کر لے، کبھی صرف رکوع، کبھی صرف حمد۔ باقی نماز تو عجمی سازش ہے جسے ملاؤں نے کمائی کا ذریعہ بنا لیا۔ مسلمان کی تو ساری زندگی نماز ہوتی ہے وہ جہاں، جس حال میں جو بھی کام کر رہا ہے، وہ اس کی دائمی نماز میں شامل ہے۔

ہمارا مشورہ یہ ہے کہ قذافی صاحب اس خاص معاملے میں پاکستان کے منکرین حدیث سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ یہ ہمارے استادانِ فن کو چاہیے کہ وہ ان پر بھرپور تبلیغ کریں۔

آخر میں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ فتنۂ انکار حدیث سے جو خاص خاص بحثیں پیدا ہوتی ہیں اور جن میں سے کچھ کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے، ان کے جوابات چونکہ بار بار پر زور طریق سے دیئے جا چکے ہیں اور اسی کوشش کا نتیجہ ہے کہ منکرین حدیث کا خواب درہم برہم ہو گیا، لہٰذا اب ان باتوں کو دہرانا غیر ضروری ہے۔

اقبال عالمی کانگرس، لاہور

یوں تو دنیا کے اکثر ممالک نے ۱۹۷۷ء میں اقبال صدی تقاریب منا کر ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کے مشرق کے عظیم شاعر علامہ اقبال کے علمی اور ادبی کمالات کو خراج تحسین پیش کیا لیکن ہندوستان اور پاکستان میں یہ تقریب جس طرح سے منائی گئی وہ اقبال کے لئے صرف خراج تحسین یا خراج عقیدت کا مظہر ہی نہیں تھی بلکہ اس سے یہ حقیقت بھی نمایاں ہو رہی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے دل میں اپنے اس فرزند جلیل کے لئے کس قدر بے پایاں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

پاکستان نے اس جشن کے لئے دسمبر کے پہلے ہفتے کی تاریخیں مقرر کی تھیں جن کا انتظار دنیا کے اکثر حصوں میں بڑی بے تابی کے ساتھ کیا جا رہا تھا، آخر وہ مبارک ساعت آگئی جب دنیا کے تقریباً اسّی مندوبین کے ساتھ مجھے بھی یہ موقع ملا کہ میں لاہور جا کر اس بین الاقوامی کانگریس میں شریک ہو سکوں۔

مجھے لاہور جانے کا اتفاق بارہ برس کے بعد ہو رہا تھا۔ صرف یہی نہیں کہ لاہور ایک ایسی جگہ ہے جہاں میں نے اپنا لڑکپن بسر کیا بلکہ لاہور میرے لیے اور بھی کئی اہمیتیں رکھتا ہے، چنانچہ لاہور روانہ ہوتے وقت یہ تمام پہلو میرے سامنے تھے اور اسے میں اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ بارہ برس بعد مجھے مزار اقبال کی زیارت نصیب ہوئی۔ جاوید منزل کے دیدار سے میں نے اپنی آنکھیں روشن کیں۔ جاوید اور ناصرہ کو دیکھا۔ ان سے باتیں کیں۔ اس یونیورسٹی میں گیا جہاں میں نے اپنے اساتذہ کے قدموں میں بیٹھ کر بات کرنے کا طریقہ سیکھا تھا۔ ان اساتذہ میں سے ڈاکٹر شیخ محمد اقبال جو میرے زمانے میں اورینٹل کالج لاہور میں وائس پرنسپل تھے۔ سید عابد علی عابد اور مولانا علم الدین سالک تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ خداوند کریم انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اور صوفی غلام مصطفیٰ (۱۰ فروری ۱۹۷۸ء کو صوفی غلام مصطفیٰ تبسم بھی اس جہان فانی سے کوچ کر گئے) ہماری اور علم و ادب کی خوش قسمتی سے ہم میں موجود ہیں۔ ان کی قدمبوسی کی سعادت اس سفر میں حاصل ہوئی، میری دعا ہے کہ ان کا سایہ طویل مدت تک اردو اور فارسی ادب پر قائم رہے۔

اقبال عالمی کانگرس در اصل اہل پاکستان کے ذوق و شوق کا ایک کرشمہ تھا اور

> محترمی جلیس ندوی صاحب، تسلیم
>
> عنایت نامہ ملا۔ سراپا سپاس ہوں۔ اس کے بعد تعمیر حیات کا وہ شمارہ بھی ملا جس میں میری لاہور والی تقریر چھپی ہے۔
>
> میں "تعمیر حیات" کے مندرجات پسند کرتا ہوں۔ اکثر تحریریں درد بھرے دل سے لکھی ہوتی ہیں۔ اس خط کے ساتھ اپنی ایک اور تقریر آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں "تعمیر حیات" کے لیے۔ یہ اقبال عالمی کانگریس لاہور کے متعلق ہے۔ چند دن ہوئے میں نے سری نگر ریڈیو سے نشر کی تھی۔ اس کی دو نقول ٹیپ سے تیار کرائی گئی تھیں۔ ایک میں نے پاکستان بھیج دی "نوائے وقت" میں اشاعت کے لئے دوسری آپ کی نذر ہے "تعمیر حیات" کے لیے۔
>
> میرا بیٹا آدرش کمار لکھنؤ ٹیلی ویژن میں پروڈیوسر ہے کبھی ٹیلی ویژن سنٹر کی طرف جانا ہو تو اس سے ملیے گا تاکہ اسے لکھنؤ میں اجنبیت کا احساس نہ ہو۔
>
> نیاز مند جگن ناتھ آزاد
>
> صدر شعبۂ اردو۔ جموں یونیورسٹی جموں

حکومت پاکستان نے اس ذوق و شوق کو عملی صورت دینے کے لئے کئی کمیٹیاں قائم کیں۔ مثلاً نیشنل کمیٹی، ایگزیکٹیو کمیٹی، آرگنائزنگ کمیٹی، استقبالیہ کمیٹی وغیرہ۔ اس کے علاوہ متعدد سب کمیٹیاں بھی مصروف کار تھیں جیسے پرنٹنگ اور پبلی کیشن کمیٹی، انتظام قیام کمیٹی، سووینیر کمیٹی، تقابل دید مقامات کمیٹی، پبلسٹی کمیٹی، ڈاکومنٹری کمیٹی، کلچرل پروگرام کمیٹی، نمائش کتب کمیٹی، آرائش کمیٹی، مالیاتی کمیٹی، پروگرام کمیٹی، رابطہ کمیٹی وغیرہ۔ اور یہ عالمی کانگرس ان تمام کمیٹیوں کے اشتراک عمل کا ایک خوبصورت مظہر تھی۔

یہ عالمی کانگرس ایک جلوہ صد رنگ تھا جس کا ہر پہلو ہر اعتبار سے قابل تعریف تھا۔ ہم لوگوں نے لاہور کے ہوائی اڈے پر اترنے کے وقت سے لے کر روانگی کے وقت تک کمیٹیوں کے ارکان کو ایک لمحہ کے لیے بھی آرام سے بیٹھے نہیں دیکھا۔ انھیں یہی دھن سوار تھی کہ کانگریس کا پروگرام خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پذیر ہو اور اس کے ساتھ پاکستان اور بیرون پاکستان سے آئے ہوئے تمام مہمانوں کو پورا آرام ملے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ دونوں آرزوئیں پوری ہوئیں۔

جب کوئی کام جماعتی یا اجتماعی جذبے سے کیا جائے اس میں افراد کا ذکر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا لیکن جماعت بھی افراد سے بنتی ہے اس لئے میں محسوس کرتا ہوں کہ کانگریس کی عدیم النظیر کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے بعض حضرات کا ذکر نہ کرنا حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہوگا اور یہ حضرات ہیں ڈاکٹر حیرت محمد ابن رسا، ڈاکٹر رفیق احمد، ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر خواجہ غلام صادق، ڈاکٹر بلوچ، ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر ریاض الرحمٰن، ڈاکٹر میزالدین چغتائی، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر معزالدین، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر محمد وارث میر اور پروفیسر محمد عثمان۔

یہاں اس بات کا بھی مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ اس وقت جلدی میں مجھے تمام نام یاد نہیں آرہے ہیں یعنی یہ فہرست پیش کرتے ہوئے اپنے عزیز دوستوں فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کے نام ہی بھول گیا ہوں جن کی موجودگی اس کانگرس کی چمک دمک میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس طرح ماہر اقبالیات بشیر احمد ڈار کے نام کو بھول جانا۔ اور میں اس سہو کا مرتکب ہوا ہوں۔ جو ایک کوتاہی سے کم نہیں۔ لیکن چونکہ میرا مقصد ناموں کی فہرست گنوانا نہیں ہے بلکہ اس امر کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ ٹیم اسپرٹ سے کتنا بڑا معجزہ ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ اس لئے غالباً ناموں کی کمی بیشی میرے مقصد پر اثر انداز نہیں ہوگی اور میری یہ کوتاہی قابل معافی سمجھی جائے گی۔

میں نے اس اقبال عالمی کانگرس INTERNATIONAL CONGRESS ON ALLAMA MOHAMMAD IQBAL کو ایک معجزہ کہا ہے۔ جی ہاں، یہ ایک معجزہ تھا۔ پاکستان سمیت دنیا کے تیس ملکوں سے ایک سو اسّی کے قریب مندوبین کو مدعو اور ہفتے تک انتہائی اونچی علمی و ادبی سطح کی ایک محفل سجانا اور وہ بھی دو شہروں میں، ایک معجزے سے کم نہیں تھا، جو کچھ میں نے ان سات آٹھ دنوں میں دیکھا اسے پوری طرح سے بیان کرنے کے لئے شاید مجھے الفاظ نہ مل سکیں۔

جہاں تک اس کانگرس کے علمی معیار کا تعلق ہے، اس خاکسار کے علاوہ ہر مندوب علم و ادب کی دنیا میں ایک اونچے مرتبے کا حامل تھا۔ یہ وہ مندوب تھے جن کے اوراق زندگی اقبالیات اور اسلامیات پر کئے ہوئے کاموں کی روشنی سے چمک رہے تھے۔ آپ چند نام سنئے تاکہ آپ خود ہی میرے دعوے کی تصدیق کر سکیں۔ کینیڈا سے شیلا میکڈونو آئی تھیں۔ چیکوسلواکیہ سے ڈاکٹر یان مارک، روس سے ڈاکٹر سوخوچوف اور ڈاکٹر لغفاروف مصر سے ڈاکٹر حسین مجیب المصری، فن لینڈ سے جوسی آرو، فرانس سے ایوا موروچ، ایران سے جلا ہامتینی، عراق سے عبدالرزاق محی الدین، اٹلی سے ایساندر بسانی، جاپان سے حاجی عبدالکریم سیاتو، سوڈان سے مبارک مغربی، سوئزر لینڈ سے ڈاکٹر جے سی پروگل، ترکی سے میڈم پر ہان اور عبدالقادر کرہان، انگلستان سے پروفیسر رالف رسل اور ڈاکٹر صابری تبریزی، امریکہ سے ڈاکٹر باربرا میٹکاف، جرمنی سے ڈاکٹر ریشہ اور میری سرزمین ہندوستان سے اس خاکسار کے علاوہ آل احمد سرور، علی سردار جعفری اور صباح الدین عبدالرحمٰن۔

یہ فہرست بھی مکمل نہیں ہے کیونکہ یہاں بھی ناموں کی مکمل فہرست گنوانا میرا مقصد نہیں بلکہ محض مشتے نمونہ از خروارے پیش کرنا میرے مد نظر ہے۔ ظاہر ہے کہ ان علماء کے مقالات کا کتنا اونچا معیار رہا ہوگا اور آرگنائزنگ کمیٹی کا کمال یہ ہے کہ ہماری واپسی سے قبل ان مقالات پر مشتمل چار ضخیم جلدیں انہوں نے ہم تمام مندوبین کے حوالے کر دیں۔

دو جلدیں اور ہمیں چند روز تک ملنے والی ہیں دنیا مشرق اور مغرب کے ماہرین اقبالیات کے افکار جو اس کانگرس میں پیش کئے گئے مکمل طور پر محفوظ کر لئے گئے ہیں اور دنیا کی کوئی لائبریری ان مجموعوں پر فخر کر سکتی ہے۔ اتنے کم وقت میں اس قدر ضخیم کتابوں کا تیار ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں۔

یہ تو کانگریس کا ایک پہلو تھا کتابوں کے تحائف جو کانگرس کی طرف سے اور کانگریس کے علاوہ پاکستان کے مصنفین اور ناشرین کی طرف سے ہر دونوں کو ملے آننا بڑا اخزانہ ہے جو اس کانگریس میں شرکت کئے بغیر نہیں حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ تو ہوئی مقالوں اور کتابوں کی بات یعنی بقول اقبال "علم و خرد" کی بات۔ اب سنیئے عشق کی بات تو جذبۂ عشق محض کتابوں اور مقالات سے کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔ اس کے لئے جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں ایک دوسری دنیا موجود تھی یعنی ہم لوگوں کی جاوید منزل میں اور مزار اقبال پر حاضری۔ جاوید منزل وہ مکان ہے جس میں علامہ اقبال مرحوم نے اپنی زندگی کے آخر چند برس بسر کئے تھے۔ آج یہ مکان ایک قومی عجائب گھر کی حیثیت رکھتا ہے جس میں علامہ اقبال کے زیر استعمال آنے والا سامان اور مختلف چیزیں وہاں موجود ہیں، مثلاً پلنگ، حقہ، استعمال کے کپڑے، میز، کرسی، ڈائننگ ٹیبل وغیرہ اور ان سب سے بڑھ کے علامہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے۔ ان تمام اشیاء کی دید سے آنکھیں روشن ہوئیں۔ یہاں صنعت میر تقی کے بنائے ہوئے ان عمارتوں کے ماڈل رکھے ہیں جن کے ساتھ علامہ اقبال کا تعلق رہا ہے۔ جاوید منزل سے قبل ہم لوگوں نے شاہی مسجد کی زیارت کی۔ بعض مندوبین کے لئے اس جلیل و جمیل تعمیر کو دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ اس لئے ان کی خاطر ہم وہاں بہت دیر تک رکے رہے۔

یوں تو میرے لئے اس سفر کا حاصل سفر کئی پہلوؤں پر مشتمل تھا لیکن مزار اقبال کی زیارت ان تمام پہلوؤں میں ایک بہت ہی اہم پہلو تھا۔ میری نظروں کے سامنے خاک کے نیچے وہ عظیم فن کار خوابیدہ تھا جس کے نغموں نے مشرق و مغرب کو رموز زندگی سے آشنا کیا تھا۔ اس وقت میری زبان پر اس فنکار ہی کا ایک مصرعہ تھا۔ ع

"تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی"

اس عظیم جشن کا افتتاح لاہور میں ہوا اور اختتام سیالکوٹ میں۔ سیالکوٹ کو اب شہر اقبال بھی کہا جاتا ہے۔ وہاں جب ہم مندوبین کاروں اور بسوں کے ذریعے پہنچے تو ہمیں خوش آمدید کہنے کے لئے ساری آبادی اپنے اپنے گھروں سے باہر سڑکوں پر آگئی۔ قلعے میں ایک عظیم پبلک جلسہ منعقد ہوا جس میں متعدد مندوبین نے کانگریس کے متعلق اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کھانے کے بعد مندوبین اور دوسرے اہل قلم حضرات پر مشتمل ایک جلوس اقبال کو خراج عقیدت ادا کرنے کے لئے قلعے سے چل کے علامہ اقبال کے آبائی مکان پر پہنچا۔ یہ وہی مکان ہے جہاں آج سے سو برس قبل مشرق کے اس عظیم فن کار نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اس جلوس کی رہنمائی کا شرف اس خاکسار کو حاصل ہوا۔ یہ صرف ایک اعزاز ہی نہیں تھا بلکہ اس میں تنظیمی کا جذبۂ محبت بھی شامل تھا اس کام کے لئے جو ہندوستان میں اقبال پر ہوا اور ہندوستان سے آئے ہوئے مندوبین کے لئے، یہ جلوس تمام وقت پھولوں کی بارش میں رواں دواں رہا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اہل سیالکوٹ نے جلوس پر منٹوں کی مقدار میں پھولوں کی پتیاں برسائیں یا ٹنوں کی مقدار میں لیکن مجھ خاکسار کو تین چار فرلانگ پھولوں کی دبیز سطح پر چلنے کا اتفاق زندگی میں پہلی بار حاصل ہوا تھا اور میرے ساتھ تمام مندوبین کو۔ اس سے قبل ایک اور ہندوستانی مندوب جناب صباح الدین عبدالرحمٰن (ناظم دار المصنفین و مدیر ماہنامہ "معارف") لاہور میں مقالات کے ایک سیشن کی صدارت بھی کر چکے تھے۔ اسی سیالکوٹ ہی میں اس کانگرس کی آخری تقریب ایک ہند و پاک مشاعرے کی صورت میں ۸ دسمبر کی رات کو شروع ہوئی اور ۹ دسمبر کی صبح کو ۴ بجے کے قریب اختتام پذیر ہوئی۔ اس اختتامی تقریب کی صدارت کا اعزاز بھی اس فقیر کو حاصل ہوا۔ اس مشاعرے میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، علی سردار جعفری، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، فراز احمد، منیر نیازی، طفیل ہوشیارپوری اور دوسرے شعراء نے اپنا اپنا کلام سنایا۔

آٹھ دنوں کی مدت میں اس کانگرس سے باہر بھی بعض ادبی اجلاس ہوتے رہے مثلاً پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اردو اسلامک انسائیکلوپیڈیا کے متعلق ایک اجلاس منعقد ہوا جس کا انتظام استاد محترم ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے کیا اور جس میں سید نذیر نیازی کو ان کی علمی و ادبی خدمات کی بنا پر دس ہزار روپے کی تھیلی اور خلعت پیش کی گئی۔

دوسرا اہم اجلاس "نقوش" کے اقبال نمبر کے اجراء کے سلسلے میں تھا۔ ان اجلاسوں کی ایک اہمیت یہ بھی تھی کہ یہاں پاکستان کے اکثر ادیبوں، شاعروں اور اپنے نئے پرانے دوستوں سے ملاقات ہوگئی۔ ہال ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں سے بھرا ہوا تھا۔ اور ہاں یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا کہ اقبال پر کتابوں کی نمائش اور کلام اقبال کی مصوری کے نمونوں کی صورت میں اس کانگرس کے دو بہت اہم شعبے تھے۔ کتابوں کی نمائش کا انتظام ڈاکٹر وحید قریشی اور ان کے رفقائے کار پروفیسر رفیع الدین ہاشمی اور پروفیسر سلیم اختر نے کیا اور مصوری کی نمائش میں ہمیں ایشیا کے عظیم مصور عبدالرحمٰن چغتائی اور پاکستان کے نامی فن کار صادقین صدق کی تصاویر دیکھنے کو ملیں۔

بیگم عبادت بریلوی وہاں ایک گورنمنٹ گرلز کالج کی پرنسپل ہیں۔ انہوں نے اپنے کالج میں ایک جلسے کا اہتمام کیا جس میں پروفیسر رلیف رسل، پروفیسر آل احمد سرور اور میں نے شرکت کی۔ میری شرکت در اصل اس جلسے میں بہت مختصر رہی کیونکہ اسی تاریخ کو اور قریب قریب اسی وقت ایم۔ اے۔ او کالج کے اساتذہ و طلباء چند روز قبل مجھ سے بات چیت کرنے کے لئے پروگرام طے کر چکے تھے۔ اس جلسے کا اہتمام عطاء الحق قاسمی نے کیا تھا اور اس کی صدارت احمد ندیم قاسمی نے کی۔ اس میں بعض مقررین حضرات نے میرے والد محترم کا ذکر بڑی محبت سے کیا جس سے میں بھی بہت متاثر ہوا۔

اقبال عالمی کانگریس کے بعد آل احمد سرور، علی سردار جعفری اور صباح الدین عبدالرحمٰن لاہور سے کراچی روانہ ہو گئے۔ جن حضرات نے اس دور کے پاکستانی جرائد دیکھے ہیں، انہیں بخوبی علم ہوگا کہ کراچی میں ان تینوں حضرات کی کس محبت اور خلوص سے پذیرائی کی گئی۔

سرور صاحب کو پاکستان کے ادبی جلسوں میں استاذ الاساتذہ کے نام سے پکارا گیا لاہور اور کراچی میں یونیورسٹیوں کے اساتذہ نے ان کی راہ میں آنکھیں بچھائیں۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی حیثیت لاہور، سیالکوٹ اور کراچی میں ایک ادارے کی رہی۔ "معارف" کا مدیر بھائی ندوی مرحوم کی یادگار اور اقبالیات پر گہری نظر رکھنے والا عالم پاکستان میں سید صاحب کی موجودگی ایک نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتی تھی۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ جشن اقبال علمی اور ادبی اہمیت کے علاوہ وہ ایک اور اہمیت کا حامل بھی تھا، اور وہ یہ کہ اس نے ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں کو اتنی مدت کے بعد ایک دوسرے سے ملنے کا موقع فراہم کیا اور اگرچہ اس موقع پر تمام دنیا کے اقبال شناس بڑے تپاک کے ساتھ آپس میں مل رہے تھے لیکن ہندوستانی اور پاکستانی ادیبوں کے قہقہوں اور آنسوؤں کے درمیان ایک دوسرے کے ساتھ ملنے کی بات ہی اور تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے فضا کے ہر گوشے سے یہ آواز سنائی دے رہی ہے۔ ع

آملے ہیں سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک

ضروری اعلان!

جن حضرات کے چندے ختم ہوتے ہیں ان کو لال نشان یا خط کے ذریعہ اطلاع دی جاتی ہے۔

آپ کو ختم چندہ کی اطلاع ملے تو فوراً اپنا چندہ ارسال کریں۔

ورنہ

پندرہ روز انتظار کے بعد اگلا شمارہ وی۔ پی سے روانہ ہوگا جس میں 3/25 آپ کو زائد دینے پڑیں گے۔

منی آرڈر فارم میں نیچے کوپن پر اپنا پورا پتہ اور خریداری نمبر ضرور لکھا کریں،

ورنہ آپ کا چندہ جمع ہونے میں دشواری ہوگی۔

(منیجر تعمیر حیات)

عربی ابجد خوانی کی ”بامعنی“ تعلیم

حافظ فضل الرحمٰن ندوی

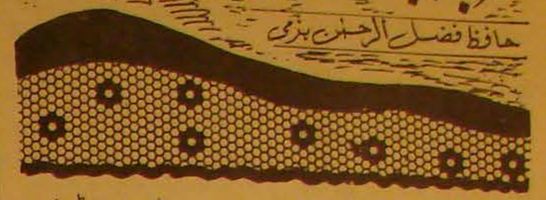

”قاعدہ تعلیم القرآن بامعنی“ کے ذریعہ (جسے ادارہ فروغ عربی، قاضی ٹولہ مؤناتھ بھنجن نے شائع کیا ہے) عربی حروف و حرکات شناسی کی ”بامعنی تعلیم“ کا جو کامیاب تجربہ پیش کیا گیا ہے، وہ عربی مکاتب کے عام تعلیمی رواج و مزاج کے لیے نیا اور ”اجنبی“ تو ضرور ہے لیکن اس کی اس کی اہمیت و افادیت سے انکار کرنا مشکل ہے۔

چونکہ ”اجنبیت“ باعث وحشت ہوتی ہے اس لئے اس وحشت و اجنبیت کو دور کرنے کے لئے مندرجہ ذیل معروضات پیش خدمت ہیں:۔

ہم مثلاً ”جَانَ حَانَ خَانَ“ کی تعلیم دیتے ہیں تو اس کے دو مقصد ہوتے ہیں۔

۱۔ ایک تو یہ کہ مبتدی بچے ”ج ح خ“ کی ان غیر سالم شکلوں سے واقف و آشنا ہو جائیں جو ”الف“ سے ملنے کی صورت میں استعمال ہوتی ہیں۔

دوسرا یہ کہ ”ج ح خ“ پر ”زبر“ کی حرکت سادہ (ــَ) کے عمل کی تعلیم و مشق کے بعد اب حرکت طویلہ (ــَا) کے عمل کی تعلیم دی جائے اور مبتدیوں میں ”جَ حَ خَ“ (سالم شکلوں) پھر ”جـَ حـَ خـَ“ (غیر سالم شکلوں) اور بعد ازاں ”جَا حَا خَا“ (دو حرفی مخلوط مرکبات) میں فرق و امتیاز کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ (دیکھیے قاعدہ حصہ اول صفحہ ۸)

یہ دونوں بنیادی مقاصد ہم جَانَ کے بجائے جَاءُ یا جَارٌ، حَانَ کے بجائے حَالُ یا حَالٌ اور خَانَ کے بجائے خَافَ خَالٌ یا خَادِمٌ جیسے بامعنی (بولتے ہوئے) الفاظ کے ذریعہ بھی بلا کسی مزید اہتمام یا زحمت کے حاصل کر سکتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ حاصل ہی کر سکتے ہیں بلکہ نسبتاً زیادہ بہتر طریقہ پر حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ جَانَ حَانَ خَانَ“ کے بجائے مثلاً ”جَارٌ (پڑوسی)، حَالُ (حال) اور خَافَ (ڈر گیا) جیسے الفاظ کے استعمال کا ایک فوری اور نقد تعلیمی فائدہ تو یہی ہے کہ اول الذکر میں تیسرے حرف کی جگہ صرف ایک ہی حرف ”نَ“ اور ایک ہی حرکت ”زبر“ کی تکرار ہوتی ہے جب کہ موخر الذکر میں تین حرفوں (رٌ۔ لُ۔ فَ) اور اکہرے اعراب (ــَ) کے علاوہ دُہرے اعراب (ــٌ) کی تکرار مراجعت اور مشق بھی ہو جاتی ہے اور اگر لگے ہاتھوں خَافَ اور جَارٌ کو اکٹھا کر کے خَافَ جَارٌ (پڑوسی ڈر گیا) کر دیجئے تو آپ بچوں کو مفت میں ایک آسان زود فہم اور کار آمد جملہ بھی بطور انعام و حوصلہ افزائی عطا کر سکتے ہیں۔

اس طریقۂ تعلیم کے متعلق دو اشکال پیش کئے جاتے ہیں:۔

۱۔ یہ کہ بچوں کے لئے ہجے کے ساتھ ”معنی“ بھی یاد کرنا مشکل اور ایک تکلیف مالا یطاق ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ عربی مکاتب کے عام مدرسین کرام ”عربی داں“ نہیں ہوتے اس وجہ سے ان کے لئے ”بامعنی تعلیم“ دینا ناممکن ہے۔

پہلے اشکال کا نقلی جواب ”تجربات کی روشنی میں“ یہ ہے کہ معصوم بچے کسی لفظ کے ”ہجے اور معنی“ نہ صرف یہ کہ نہایت آسانی کے ساتھ یاد ہی کر لیتے ہیں بلکہ ”معنی“ سے واقفیت اور جملوں میں اس کے اجراء و استعمال کے باعث ان کی تعلیمی دلچسپی میں حیرت انگیز اضافہ بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اس اشکال کے عقلی جواب کے لئے ہم آپ کو ”مکتب“ اور ”نرسری“ کی تعلیم کا بس ایک سرسری ہی سا جائزہ لینے کی زحمت دیں گے۔

”نرسری“ میں تعلیم پانے والے بچے ـــ جو تقریباً اسی عمر کے ہوتے ہیں جس عمر کے بچے ”مکتب“ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ انگریزی جیسی بے ہنگم اور بے اصول زبان کے عسیر الادا الفاظ اور ان الفاظ کے ”ثقیل و طویل ہجے“ اور ان کے ”معنی“ نہایت آسانی اور دلچسپی کے ساتھ یاد کر لیتے ہیں اس کے مقابلہ میں عربی جیسی دنیا کی شیریں ترین با اصول اور قرآنی زبان کے آسان الفاظ اور ان کے پابند ضابطہ ہجے“ کے ساتھ ”معنی“ بھی یاد کر لینا کس قدر سہل اور آسان اور ولقد یسرنا القرآن

کی ہمہ گیر صداقت کا بین نشان ہو سکتا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے مندرجہ ذیل گوشوارہ کا تقابلی مطالعہ ان شاء اللہ یقیناً موجب طمانینت و باعث دلچسپی ہوگا۔

تقابلی گوشوارہ

درس گاہ	تعداد حروف اور ہجے	تلفظ اور معنی
نرسری	ایف۔ اے۔ ٹی۔ ایچ۔ ای۔ آر	فادر معنی ابا
مکتب	اَ ۔ بٌ	اَبٌ ” ”
نرسری	بی۔ آر۔ اُو۔ ٹی۔ ایچ۔ ای۔ آر	برادر معنی بھائی
مکتب	(ہجے کی ضرورت نہیں)	اَخٌ ” ”
نرسری	ڈبلیو۔ ایچ۔ اے۔ ٹی	وہاٹ معنی کیا
مکتب	(رواں)	مَا ” ”

اب جہاں تک دوسرے اشکال کا سوال ہے تو اس کے متعلق عرض ہے کہ اس کا حل مدرسین کرام کے ذاتی شوق، مذاق علمی، جذبہ عمل اور ثواب اخروی کے یقین کامل پر منحصر ہے۔

قناعت و جمود کا تو کوئی علاج نہیں ہے ورنہ اگر ”بے شعور“ بچوں کے لئے اَبٌ اور اَخٌ کے معنی یاد کر لینا کچھ بھی مشکل نہیں ہے تو ”باشعور“ مدرسین کے لئے بھلا کیونکر مشکل ہو سکتا ہے انہیں تو بچوں کو یاد کراتے کراتے سن ہی سن کر ان شاء اللہ یاد ہو جائیں گے اور بحمد اللہ اس کا بھی تجربہ ہو چکا ہے۔

مدرسین کرام اگر صرف ایک بار محض معمولی سی توجہ سے ”تعلم“ (سیکھنے) کا فریضہ انجام دے لیںگے تو پھر ”تعلیم“ (سکھانے) کا فریضہ انجام دینے میں انہیں ان شاء اللہ آئندہ کوئی بھی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

مدرسین کرام کا یہ عذر کہ ”اب بوڑھا طوطا بھلا کیا پڑھے گا“، محض ایک عذر لنگ بلکہ ایک شیطانی مغالطہ ہے کیونکہ تحصیل علم اور طالب علمانہ زندگی تو اگر مرتے دم تک جاری و قائم رہے تو یہ عین سعادت ہے۔

”قاعدہ تعلیم القرآن بامعنی“ کے سلسلہ اسباق کی خصوصیت اور نوعیت یہ ہے کہ تقریباً ہر سبق میں نوعمر بچوں کے معیار فہم اور ان کی طاقت و استطاعت کا لحاظ کرتے ہوئے حتی الامکان صرف چند ہی نئے اور ایسے آسان الفاظ دیے گئے ہیں جن کے معنی (جو ہر نئے لفظ کے ساتھ لکھے ہوتے ہیں) یاد کر لینا قطعاً مشکل نہیں ہوتا۔

مزید براں جملوں اور ترکیبوں کی ساخت اور ترتیب بس اللہ تعالیٰ ہی کے فضل و کرم سے کچھ ایسی آسان و دلپذیر ہو گئی ہے کہ الفاظ کے معنی یاد کر لینے کے بعد عموماً نوعمر بچوں کو بھی جملوں اور ترکیبوں کا مطلب بفضلہ تعالیٰ خود بخود یا محض ذرا سے اشارے پر ہی سمجھ میں آ جاتا ہے، تاہم غیر عربی داں مدرسین کرام کی مزید سہولت کے لئے دوسرے (ترمیم شدہ) ایڈیشن میں عام طور پر جملوں کا مطلب بھی لکھ دیا گیا تاکہ مدرسین کرام کی وہ معمولی سی رکاوٹ بھی دور ہو جائے جو انہیں جملوں کا مطلب سمجھنے میں پہلی بار پیش آ سکتی تھی۔ تیسرے ایڈیشن (دوسری ترمیم) میں بھی کچھ ایسی مزید ترمیمات کی گئی ہیں جن کی وجہ سے اس کی افادیت و جامعیت میں بحمد اللہ کافی اضافہ ہو گیا ہے۔

اگر ایک ابجد خواں (قواعد بغدادی پڑھنے والا) بچہ ـــ جو ابھی حروف و حرکات و اعراب کی تمام شکلوں اور مختلف تفصیلات سے واقف و متعارف نہیں ہوا ہے ـــ چند گنے چنے اسباق کے بعد چند ہی دنوں میں ”تَعَالَ اَنَا یُوسُفُ وَهٰذَا اَخِی“ کا ترجمہ بفضلہ تعالیٰ نہایت آسانی کے ساتھ کر لے (دیکھیے قاعدہ تعلیم القرآن بامعنی حصہ اول ترمیم شدہ ایڈیشن صفحہ ۱۹) تو کیا یہ حق تعالیٰ جل شانہ کی قدرت کاملہ قرآن کریم کے اعجاز اور ولقد یسرنا القرآن کی صداقت و ہمہ گیری کا بین ثبوت اور ایک کھلا ہوا مشاہدہ نہیں ہے۔؟

لہٰذا ایک ایسے مشاہدے کو عام و ہمہ گیر کرنے اور عربی ابجد خوانی (حروف شناسی) کی تعلیم کو ایک نیا موڑ اور ایک نئی سمت سفر دے کر اسے مشکل سے آسان، ”بے معنی“ سے ”بامعنی“، ذو مقصدے ذو مقاصد اور ”چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار“ کا مصداق بنانے میں معمولی اور قیاسی اور خود ساختہ (تنقیدی جائزہ ملاحظہ ہو) دشواریوں کی بنا پر پس و پیش کرنا اور علامہ اقبال کے اس خطاب کا کہ ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی تھا

مصداق بنے بیٹھے رہنا نہ دانشمندی کا تقاضہ ہے نہ دینی و ملی خیر خواہی و خیر اندیشی کا۔

ندوۃ العلماء

منزل بہ منزل

ندوۃ العلماء کا
پانچواں اجلاس
منعقدہ ــ کانپور
۸،۷ مارچ ۱۸۹۶ء

مولانا مسیح الزماں خاں کی صدارت:

ندوۃ العلماء کا پانچواں اجلاس ۱۴، ۱۵ شوال ۱۳۱۵ھ مطابق ۸، ۹ مارچ ۱۸۹۸ء کو کانپور میں منعقد ہوا جلسے کی باقاعدہ نشست کے بعد مولانا سید محمد علی صاحب ناظم ندوۃ العلماء نے تحریک کی کہ مولانا مسیح الزماں خاں صاحب استاد حضور نظام دکن و رئیس شاہ جہاں پور اس جلسے کے صدر نشیں بنائے جائیں۔ خان بہادر منشی اطہر علی صاحب وکیل لکھنؤ نے اس کی تائید کی اور اتفاق رائے سے مولانا ممدوح صدر نشین کئے گئے۔ مولانا نے اپنی نیک نفسی سے عاجزانہ شکر گذاری کے ساتھ صدارت قبول فرمایا اور اجازت دی کہ جلسے کی کارروائی شروع کی جائے۔

مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری ناظم ندوۃ العلماء کی رپورٹ مولانا سید عبد الحی صاحب مددگار ناظم ندوۃ العلماء نے صدر انجمن کی اجازت سے بآواز بلند پڑھ کر سنائی۔

خلاصہ رپورٹ بابت سال چہارم:

جناب صدر انجمن صاحب و دیگر اعیان و ارکان ندوۃ العلماء!

ندوۃ العلماء کوئی نئی چیز نہیں ہے جس پر رائے قائم کرنے کے لئے ہم کو صرف سلسلۂ خیالات سے کام لینا پڑے بلکہ جس طور پر دنیا میں تمام کاموں کے نتیجہ نکالنے میں علل و اسباب پر غور کرنے اور اس کے نظائر کے حالات کی تفتیش کرنے کی حاجت ہوتی ہے اس طرح سے اس کے لئے بھی انہیں چیزوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اعتراضات:

جو لوگ ندوۃ العلماء پر سست رفتاری کا اعتراض کرتے ہیں وہ بڑی نظیر یہ پیش کرتے ہیں اب ندوۃ العلماء کے حالات پر غور کیجئے اس کے قائم کرنے والے وہ حضرات ہیں جو دنیوی حیثیت سے ذی وجاہت اور ممتاز نہیں بلکہ انقلاب زمانہ اور بد نصیبی سے قوم کی نگاہیں ان پر بری پڑنے لگی ہیں، اور مسلمانوں کے دلوں میں ان کی وہ عزت نہیں رہی جو دینی حیثیت سے ان کی ہونی چاہیے۔ دوسرے ندوۃ العلماء نے جن تجویزوں پر زور دینا چاہا ہے وہ ایک حد تک دیرینہ خیال حضرات کی سمجھ میں نہیں آتیں اس وجہ سے وہ لوگ اس سے علیحدہ رہے تیسرے ندوۃ العلماء کی تمام کارروائیاں چونکہ مذہبی حیثیت رکھتی ہیں اس لئے گورنمنٹ اس کی حمایت میں حصہ نہیں لے سکتی۔

چوتھے ندوۃ العلماء کے مقاصد دنیوی لحاظ سے ایسے نہیں ہیں جن کی طرف بالطبع سب کا رجحان ہو، پانچویں ندوۃ العلماء ایسے زمانے میں قائم ہوا ہے جب کہ ہر ایک جگہ انجمنیں ہو سائٹیاں بکثرت موجود ہیں اور مقامی ضرورتیں اس میں روپیہ دینے سے لوگوں کو باز رکھتی ہیں، ان باتوں پر نظر کرنے کے بعد یہ الزام جو ندوۃ العلماء پر قائم کیا جاتا ہے، بالکل نظر انداز کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تاہم میں کہتا ہوں کہ اس قلیل مدت میں ندوۃ العلماء نے جو کام کیا ہے وہ بجائے خود اس قدر ہے جو بڑی بڑی انجمنیں وسیع مدت میں نہیں کر سکتیں۔

ندوہ کا کارنامہ:

اب آپ ندوۃ العلماء کے مقاصد پر غور کیجئے کہ وہ کیا ہیں؟ اس کے سب سے بڑے دو مقصد ہیں، اول اصلاح و ترقی تعلیم، دوم رفع نزاع باہمی۔

طریقۂ تعلیم جس پر آپ بحث کر رہے ہیں کم و بیش دو سو برس سے نصاب موجودہ کے ساتھ رائج ہے ہزاروں علماء فضلاء جو ہمارے معتقد علیہ اور دینی و دنیوی حیثیت سے ہمارے مقتدا اور امام تھے اسی نصاب کے تعلیم یافتہ گذرے اور اس وقت جس قدر علماء موجود ہیں وہ سب اسی نصاب کے موافق تعلیم یافتہ ہیں اور تمام اہل اسلام جن کے قلوب میں علماء کی عظمت ہے وہ انہیں کے پیرو اور مقلد ہیں اس وجہ سے اس نصاب پر تمام علماء و عامہ اہل اسلام کو پورے طور پر وثوق اور اطمینان ہے پس ایسی حالت میں نصاب موجودہ کو باقتضائے زمانہ قابل اصلاح سمجھ کر تغیر و تبدل کی کوشش کرنا آسان کام نہیں ہے پس جو لوگ ندوۃ العلماء پر یہ الزام قائم کرتے ہیں کہ اس نے کئی برس کی غور و فکر کے بعد بھی نصاب نہیں تیار کیا وہ اس کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔

دوسرے مقصد کو لیجئے، اتفاق اور رفع نزاع باہمی، ظاہر میں یہ نہایت دلکش الفاظ ہیں مگر اس کے حاصل کرنے میں جو دقتیں اور مصیبتیں ہیں ان سے انہیں کا دل خوب واقف ہوگا جنھوں نے کبھی دنیا میں کسی بڑے کام کرنے کا ارادہ کیا ہو۔

دو انتہا پسند طبقے:

اس بات کا اندازہ کرنے کے لئے ہم کو مسلمانوں کی صرف تعلیمی اور اخلاقی حالت کی تفتیش کرنی چاہیے اول امر کے نسبت کسی قدر میں کہہ چکا ہوں اور کچھ اب بیان کرتا ہوں، اب تک عربی کی نسبت ہندوستان کے مسلمان دو قسم کے خیال رکھتے تھے ایک وہ جو نئی روشنی والوں کے لقب سے مشہور ہیں وہ اس کو مہمل بیکار اور غیر ضروری سمجھتے اور عربی علوم حاصل کرنے والوں کو احمق جانتے تھے، دوسرے جو نئی روشنی والوں میں دیرینہ خیال کے نام سے مشہور ہیں اور جن پر عربی تعلیم کا بالفعل مدار ہے ان کو چند دنوں پیشتر نصاب اور طرز تعلیم مروجہ کے ساتھ حسن عقیدت تھی جو اس میں تغیر و تبدل کو احداث فی الدین سے کم نہیں جانتے تھے، ندوۃ العلماء جب قائم ہوا تو اس نے ان دونوں کی اصلاح کرنی چاہی اس لئے اس نے اپنا ایک مقصد اصلاح و ترقی تعلیم کو قرار دیا۔ الحمد للہ کہ ندوۃ العلماء چند دنوں میں بہت کچھ کامیاب ہوا جس کی توقع مشکل سے کی جاتی تھی اس نے دونوں فرقوں میں قبولیت پیدا کی اور اپنے فرائض کو بہت ذمہ داری سے انجام دیا۔ ندوۃ العلماء نے اس تھوڑی سی مدت میں وہ کامیابی حاصل کی جس کو دوسری انجمنیں زمانہ دراز میں بھی نہیں کر سکتی تھیں اور ہم کو امید ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اسی طور پر رفتہ رفتہ ندوۃ العلماء کے اثر سے ملک و قوم کے سامنے ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ یہ تمام جھگڑے اور نزاعیں ایک بے وقعت افسانہ سمجھی جائیں گی۔ میں اس مقام پر چند نظیریں اس کی سرسری طور پر پیش کرتا ہوں۔

باہمی اختلافات میں کمی:

سب جانتے ہیں کہ ایک مدت سے تقلید و عدم تقلید کے جھگڑے کس زور و شور سے برپا ہیں جن کی وجہ سے بڑے بڑے ہنگامے ہوئے، عدالت فوجداری تک نوبت پہنچی اور لوگوں کو سزائیں ہو گئیں اسی طرح سے عدالتہائے دیوانی میں آمین بالجہر اور رفع یدین کے مقدمے دائر ہوئے علماء اور کتب مقدسہ کی آبرو ریزی ہوئی یہاں تک کہ لڑتے لڑتے ولایت مقدمے پہنچے، مگر الحمد للہ جب سے ندوۃ العلماء قائم ہوا ہے اور اس نے نزاعوں سے اپنی ناراضمندی ظاہر کی ہے اس وقت سے اب تک کوئی نزاع نہیں پیدا ہوئی اور تمام مسلمان اس جھگڑے سے نہایت امن و آسائش میں بسر کر رہے۔ مولانا شاہ امانت اللہ صاحب اور مولانا ابو محمد ابراہیم بانی مدرسہ احمدیہ آرہ کے درمیان ندوۃ العلماء نے صلح کرا دی اور پورب کے سب ہنگامے فرو ہو گئے۔ ندوۃ العلماء کا یہ کارنامہ معمولی نہیں۔

علاوہ ان سب امور کے ندوۃ العلماء کی یہ برکت کیا کم ہے کہ اب تک علماء کی جماعت میں ربط و اتحاد کا کوئی خاص سلسلہ نہ تھا اور غالباً اسی کی وجہ سے مناظروں میں سختی اور سرگرانی سے نزاعیں پیدا ہو جاتی تھیں۔ اب ندوۃ العلماء کی وجہ سے یہ بات جاتی رہی اور جو علماء سال میں ایک بار جمع ہو جاتے ہیں ان میں ایک خاص قسم کا ربط و اتحاد پیدا ہو گیا ہے اور جو بدگمانیاں نہ ملنے کی وجہ سے پیدا ہوتی تھیں وہ دور ہو گئی ہیں۔ اس لئے اب ان کی جانب سے ایک دوسرے سے منافرت پیدا ہونے کا اندیشہ نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک ان میں اتحاد باقی رہے گا مسلمانوں میں نفاق پیدا ہونے کی کوئی صورت نہیں۔

(جاری)

دار العلوم حقانیہ میں

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی آمد اور خطاب

۱۹ جولائی ۱۹۷۸ء کا دن دار العلوم حقانیہ کے لیے خوشیوں کا دن تھا۔ بلکہ یہ سارا ہفتہ مسرتوں کا موسم بہار تھا۔ ابھی چند روز پہلے ایشیائی سربراہی کانفرنس کے سلسلے میں آنے والے بھارت کے ایک محبوب و معزز مہمان شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی قدس سرہ کے جانشین و فرزند مولانا سید اسعد مدنی مدظلہ نے دار العلوم کو اپنے قدوم سے نوازا تھا اور آج دار العلوم میں عالم اسلام کے عظیم مفکر اور داعی حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی آمد آمد تھی، گو دار العلوم میں تعطیلات شعبان کی وجہ سے طلبہ موجود نہیں تھے مگر جہاں جہاں بھی اطلاع پہنچی علماء، دانشور، اور دینی ذوق سے سرشار مسلمان اس شمع علم کی زیارت کے لئے پروانوں کی طرح جمع ہو گئے۔ ایک ایک منٹ انتظار میں گذر رہا تھا، حضرت شیخ الحدیث مدظلہ علالت کے بعد مشتاق دید بیٹھے ہوئے تھے کہ مولانا موصوف کی آمد کا ایک مقصد حضرت کی ملاقات بھی تھا۔ الغرض اللہ اللہ کرکے مولانا ندوی مدظلہ اور ان کے رفقاء کا قافلہ مولانا سمیع الحق صاحب ایڈیٹر الحق کی رفاقت میں ظہر کے بعد دار العلوم پہنچا، مولانا موصوف کے ساتھ کئی ممتاز علمی اور ادبی شخصیتیں بھی شریک سفر تھیں مولانا مدظلہ کے بھتیجے مولانا محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی (عربی) مولانا معین اللہ صاحب ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا اسحاق جلیس صاحب ندوی مدیر تعمیر حیات لکھنؤ، جناب احمد الحسینی سعودی قونصل جنرل لاہور بھی مولانا مدظلہ کے ساتھ تھے۔ اسی طرح ہندوستان کے وقیع اور معروف علمی ادارہ دار المصنفین اعظم گڑھ کے ناظم اور موقر جریدہ "معارف" کے مدیر شہیر

مولانا صباح الدین عبد الرحمن صاحب بھی ساتھ تھے جو دار المصنفین کے کسی سلسلہ میں اسلام آباد میں تشریف فرما تھے اور مولانا سمیع الحق صاحب سے اتفاقیہ ملاقات کے بعد مولانا نے انہیں بھی تشریف لانے کی دعوت دی علم و فضل کے یہ اعیان مولانا ندوی مدظلہ کی قیادت میں دار العلوم پہنچے سب سے پہلے حضرت شیخ الحدیث مدظلہ سے ملاقات کی، دونوں اکابر کی محبت و عقیدت اور خلوص کی ملاقات کا منظر دیدنی تھا۔ اس کے بعد الحق کے نئے دفتر میں معزز مہمانوں نے دوپہر کا کھانا تناول فرمایا نماز عصر کے بعد دار العلوم کی جامع مسجد کے ہال میں جو اطراف و اکناف سے آئے ہوئے مشتاقین علم و فضل سے بھرا ہوا تھا، ایک مختصر تقریب کے آغاز میں مولانا سمیع الحق صاحب مدیر الحق نے عظیم اور محبوب مہمان کا خیر مقدم کرتے ہوئے استقبالیہ تقریر میں کہا کہ:

"میرے پاس وہ الفاظ نہیں جن سے حضرت الاستاذ الداعیۃ الکبیر علامہ ندوی مدظلہ کا خیر مقدم اور شکریہ ادا کروں صرف اتنا عرض ہے کہ آج دار العلوم کی شکل میں علوم دینیہ کا جو سلسلہ اللہ تعالیٰ نے چلایا وہ حضرت ندوی کے مورث اعلیٰ سیدنا الامام احمد بن عرفان الشہید شاہ اسمٰعیل شہید کا جو مقام دعوت و عزیمت تھا اس دعوت کو مولانا ندوی نے صرف عالم اسلام میں نہیں بلکہ یورپ میں اور اسلام دشمن ممالک کے آخری سرحدوں تک پہنچایا، بے شک آپ ان کے اہل وارث ہیں۔ سید احمد شہید نے جس مقام سے اپنے جہاد کا آغاز کیا وہ بھی اکوڑہ خٹک تھا اور صدیوں بعد اللہ کے دین کے لئے خالص اللہ کی رضا کے لئے برصغیر میں اگر

رپورٹنگ: جناب شفیق فاروقی

اکوڑہ خٹک میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے جہاد اور شہداء کا خون دار العلوم حقانیہ کی شکل میں رنگ لایا

خون شہادت گرا کسی مسلمان کا تو وہ سعادت اسی سرزمین اکوڑہ خٹک کو حاصل ہے۔ یہی وہ علاقہ ہے یہی وہ فضائیں ہیں جہاں آپ کے سید شہیدؒ نے سالہا سال ریاضتیں کیں ایک ایک بستی میں گشت گئے، ایک ایک حجرہ کو وعظ و تبلیغ سے منور کیا۔ یہاں انہوں نے حکومت الہیہ قائم کی اور آج تقریباً یہی وہ معرکے کا میدان ہے، جہاں اللہ تعالیٰ نے دار العلوم حقانیہ کو قائم فرمایا ہے

ہر زمیں کو نسیمے ز زلف او زدہ ست
ہنوز از سر آں بوئے زلف می آید

اور جس طرح دار العلوم دیوبند کے مقام و محل سے گزرتے ہوئے حضرت سید شہیدؒ نے فرمایا کہ،

مجھے یہاں سے علم کی خوشبو آرہی ہے۔ اسی طرح ان میدانوں اور صحراؤں میں سید شہیدؒ کی راتیں گذریں راتوں کی آہ و بکا، سوز و گداز کیا راز و نیاز ہوگا جو ان میدانوں میں ان فضاؤں میں نہیں ہوا ہوگا، اسی اکوڑہ خٹک کے معرکۂ حق و باطل والی رات کو سید شہیدؒ نے لیلۃ الفرقان کہا تھا، کہ یہ رات حق و باطل کی تمیز کا ذریعہ ٹھہری۔

میں اپنے احباب سے اور ان معزز مہمانوں سے جو حضرت ندوی مدظلہ کے ساتھ تشریف لائے اتنا عرض کروں گا کہ اس وقت عالم اسلام میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے جو مساعی ہو رہی ہیں اس میں حضرت مولانا ندوی کا نہایت وقیع، ممتاز اور وافر حصہ ہے۔ عالم عرب کو ان کا اصل مقام یاد دلانے میں ان پچیس تیس سالوں میں مولانا ندوی کا خاص حصہ ہے وہ محترم شخصیت ہم میں موجود ہیں جنہوں نے امریکہ و وائٹ ہاؤس کے قریب وہاں کی عظیم یونیورسٹیوں میں وہاں کے دانشوروں اور مستشرقین کو، اسکالروں کو عیسائیت کی مسخ شدہ تصویر دکھائی اور اسلام کی ابدی صداقتوں کو ان کے سامنے واضح کیا، بلاشبہ مولانا ندوی مدظلہ اس دور میں ایک مجددانہ کام کر رہے ہیں۔ اس صدی میں مغرب اور مغربیت اسلام اور عالم اسلام کے لئے ابتلاء عظیم کا باعث بنا تو مغرب کا جو آپریشن اور وہاں کے فلسفوں کا جو تحلیل و تجزیہ مولانا نے فرمایا اور جس اقدامی انداز میں مغربیت کا تعاقب

کیا اس کی مثال بہت کم ملے گی آج وہ نعمت خود چل کر ہمارے پاس آئی ہے، یہ دار العلوم کی سعادت ہے اور دار العلوم کا سب کچھ اکابر کی بزرگانہ توجہات کا مرہون منت ہے یہ ان حضرات اور اسلاف کا فیض ہے آج اس وادی غیر ذی زرع میں اللہ تعالیٰ نے کچھ دین کا سلسلہ چلایا۔ میں مولانا کے معزز رفقاء جو ہندوستان کے اہل علم و فضل ہیں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ محترم دوست مولانا محمد الحسنی مدیر البعث الاسلامی جنہیں اللہ نے اردو اور عربی دونوں زبانوں میں مولانا کا جانشین بنایا ہے اور ندوہ جیسے عظیم تحریک کے نائب ناظم مولانا معین اللہ ندوی صاحب، اسی طرح وقیع مجلہ تعمیر حیات کے ایڈیٹر مولانا اسحاق جلیس ندوی کا بھی شکر گذار ہوں، ان خوشیوں میں ہندوستان کے ایک اور عظیم اور قدیم ادارہ دار المصنفین جسے علامہ شبلی نے قائم کیا اور علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے پروان چڑھایا کے ناظم اور برصغیر کے قدیم موقر جریدہ "معارف" کے مدیر مولانا صباح الدین عبد الرحمن کی آمد نے اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ندوۃ العلماء اور دار المصنفین کے اکابر یہاں جمع کر دیے ہیں، ان حضرات کی برکت سے اللہ تعالیٰ دار العلوم کو دین کی خدمت انجام دینے کی بیش از بیش توفیق دے۔"

اس کے بعد مولانا ندوی مدظلہ نے مختصر خطاب فرمایا اس لئے کہ ایک تو مولانا بے حد تھکاوٹ محسوس کر رہے تھے پھر جلد ہی واپسی بھی تھی۔ تقریر کے بعد مولانا ندوی مدظلہ کے مبارک ہاتھوں دار العلوم کے طلبہ کے لئے سید احمد شہید قدس سرہ کے نام نامی پر موسوم "دار الاقامہ سید احمد شہیدؒ" کا سنگ بنیاد رکھا گیا، یہ عمارت دار الحدیث کے مغربی جانب درسگاہوں کی چھت پر بنے گی۔ یہاں سے بالکل عقب میں وہ گھاٹی ہے جہاں سے سید شہیدؒ کے مجاہدین نے اکوڑہ خٹک کے میدان میں شب خون مارا تھا۔ سنگ بنیاد رکھتے ہوئے مولانا ابو الحسن علی ندوی اور ان کے رفقاء کی مسرت قابل دید تھی۔ مولانا ندوی نے سنگ بنیاد رکھنے کے بعد تضرع و الحاح سے اس عمارت کی تکمیل کے لئے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اس دار العلوم کو دین کے داعیوں اور مجاہدین کا مرکز بنائے۔ اس کے بعد دار العلوم کے مختلف شعبوں اور عمارتوں کا معائنہ فرمایا۔ کچھ دیر دار العلوم کے دار الحدیث میں تشریف فرما رہے، وہاں دار العلوم کی کتاب الآراء میں اپنے تاثرات قلمبند فرمائے نماز مغرب کے بعد دار العلوم کے صحن میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ شائقین کے ہجوم میں حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے ساتھ بیٹھے رہے رات ساڑھے

آٹھ بجے اکوڑہ خٹک ریلوے اسٹیشن پر مولانا مدظلہ کو باچشم پرنم رخصت کیا گیا مولانا ندوی مدظلہ ان میدانوں اور فضاؤں پر بڑی والہانہ اور حسرتوں بھری نگاہیں ڈالتے رہے جہاں سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء نے برصغیر میں سب سے پہلے حکومت الہیہ کے قیام کے لئے اپنا خون پانی کی طرح بہایا۔ مولانا مدظلہ کے تحریری تاثرات یہ ہیں:

رائے گرامی مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

آج ۱۳ شعبان المعظم ۱۳۹۸ھ کا دن میرے لئے بہت ہی مسرت اور سعادت کا دن ہے کہ میں اپنے عزیز رفقاء اور محترمی سید صباح الدین عبد الرحمن ناظم دار المصنفین اعظم گڑھ و مدیر معارف کی معیت میں دار العلوم اکوڑہ خٹک حاضر ہوا، اس کی سرزمین سے جس میں یہ دار العلوم واقع ہے ایک وقیع اور عزیز تاریخ اور بڑی یادگار روایات وابستہ ہیں۔ یہ وہ سرزمین ہے جس پر مسلمانوں کی نئی تاریخ لکھی جانے والی تھی مگر وہ نامکمل رہ گئی۔ اور اسی کے ساتھ احیائے اسلام اور مسلمانوں کا نشاۃ ثانیہ کی تاریخ کا ورق الٹ گیا۔ دار العلوم حقانیہ کا قیام ایک فال نیک ہے۔ اور ان ہی شہیدوں اور مخلصوں کی جانفشانیوں کی برکت ہے۔ میرے ذہن میں دار العلوم کا جو نقشہ اور تصور تھا۔ میں نے اس کو اس سے کہیں وسیع تر پایا۔ اس کو دیکھ کر امید پیدا ہوتی ہے کہ یہ ملک کا مرکزی دار العلوم اور عظیم جامعہ اسلامیہ ثابت ہوگا۔ خوش قسمتی سے اس کو حضرت مولانا عبد الحق مدظلہ کی سرپرستی اور ان کی دعا اور توجہ حاصل ہے۔ اسی کے ساتھ فاضل اساتذہ کی تدریسی خدمات اور طلبہ کی کثیر تعداد بھی یہاں موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کو نظر بد سے بچائے اور ہر طرح کی آفات اور مکروہات سے حفاظت فرمائے اور یہ جلد منازل ترقی طے کرکے بام عروج پر پہنچے۔

خاکسار
ابو الحسن علی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کا خطاب:

(خطبہ مسنونہ کے بعد)

میرے بزرگو، دوستو اور عزیزو! ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک عشاء کی نماز کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجرہ مبارک سے باہر تشریف نہیں لائے، بہت دیر ہو گئی، جو معمول تھا معمول کے مطابق آپ وارد نہیں ہوئے، مسلمان اس اشتیاق میں بیٹھے ہوئے تھے کہ جن کی تعلیم سے اور جن کی برکت سے نماز سیکھی ہے ان کے پیچھے اس مسجد میں جو لمسجد اسس علی التقویٰ کا مصداق ہے عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے گھر جائیں اور آرام کریں۔ یہ لوگ وہ تھے جو دن بھر ہاتھوں پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہے تھے، بلکہ کھیتوں میں، باغوں میں، دکانوں پر سارا دن محنت کرتے رہے تھے وہ گرمیوں کا زمانہ تھا یا جاڑوں کی رات تھی اگر گرمیوں کا زمانہ تھا تو مدینہ کی گرمی سب کو معلوم ہے، بہت سخت، ایسی جھلسا دینے والی، جلا دینے والی گرمی، اس میں سارا دن کام کرتے رہے اور اب آئے تھے کہ نماز پڑھ کر جا کر سو رہیں گے لیکن اللہ کا رسول حجرے سے باہر نہیں آیا تھا۔ لوگ کچھ اونگھنے لگے تھے، کچھ سونے لگے تھے سب پر نیند کا اور تھکان کا غلبہ تھا، حضرت عمرؓ نے جو امت کے اتالیق تھے اور بڑے شفیق تھے، انہوں نے محسوس کیا اور آواز دی کہ یا رسول اللہ بچے اور عورتیں سونے لگے ہیں، آپ باہر تشریف لائے، لوگوں پر ایک نگاہ ڈالی اور فرمایا کہ اس وقت روئے زمین پر نماز کے انتظار میں جاگنے والے تمہارے سوا اور کوئی نہیں، یعنی جاگنے والے تو بہت ہیں اور جمع ہونے والے بھی بہت ہیں تفریح کے لئے ملنے جلنے کے لئے وقت کاٹنے کے لئے لیکن تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

ہجرت کے شروع کا یہ قصہ ہے یاد رکھیے کہ تو اصل میں قیمت اور قدر نوعیت کی ہوتی ہے۔ قیمت مقصد کی ہے اور نوعیت کی ہے۔ تعداد کی اور اژدحام کی نہیں اسی طریقے سے ہندوستان میں جب سے اسلام آیا ہے لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا، فتوحات پر فتوحات ہوتی رہیں۔ اور اتفاق سے فاتح آپ کے اس علاقے سے داخل ہوتے رہے درہ خیبر کے راستے سے یا بولان سے یہاں سے اسلامی فوجیں گذرتی رہیں، اللہ ان کو جزائے خیر دے ہم ان کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں کہ ان کی برکت سے ہندوستان میں اسلام کا جھنڈا بلند ہوا۔ اسلام چاہے سندھ میں ملتان تک عربوں کے ذریعہ زیادہ پھیلا ہو لیکن بہرحال اسلام کی عظمت یہاں قائم ہوئی اور بہت سے ایسے لوگ جو تیسری افادیت اور مادی فائدہ دیکھے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے انہوں نے اسلام قبول کیا اور اس کے بعد ان کی اولاد میں ہزاروں لاکھوں اولیاء اللہ اور علماء ربانی پیدا ہوئے ہم ان بادشاہوں کا اور فاتحین کا بھی احسان نہیں بھول سکتے اور ہم ان لوگوں میں سے ہونا چاہتے ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں آیا ہے کہ،

والذین جاءوا من بعدھم یقولون ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ربنا انک رءوف رحیم۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ان مہاجرین و انصار کے بعد جو لوگ آئیں گے وہ کہیں گے کہ یا اللہ ہماری مغفرت بھی فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی بھی جو الذین سبقونا بالایمان۔ جو ایمان میں سبقت لے گئے۔ دنیا سے ایمان کے ساتھ پہلے چلے گئے تو ہم محمود غزنوی اور ان سے پہلے اگر کوئی آیا ہو تو اس وقت سے لے کر احمد شاہ درانی تک جو اس راستے سے آنے والوں میں سب سے آخر میں آنے والا تھا اور جس نے کہ مسلمانوں کے خلاف جو طاقتیں جمع ہو رہی تھیں ہندوستان میں اور جن کی قیادت مرہٹے کر رہے تھے اور ان طاقتوں کی کمر توڑ دی۔ اور مغلیہ سلطنت بلکہ مسلمانوں کی عظمت و تہذیب کے گل ہوتے چراغ کو پھر تھوڑا سا تیل اور بتی مہیا کر دی اور ہندوستان کے مسلمان پھر ۵۰۔۶۰ برس کے لئے یہاں اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگے اور اسلام کی شوکت کا نقش قائم ہو گیا ہم ان سب کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں اور انشاء اللہ کرتے رہیں گے اور ہم کو یہ راستہ بھی عزیز ہے جس راستہ سے یہ فاتح اور کشور کشا آئے لیکن جیسا کہ ابھی مولانا سمیع الحق صاحب نے فرمایا اور بجا فرمایا کہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے خالص اللہ کی رضا کے لئے اور سنتوں کو زندہ کرنے کے لئے اور مسلمانوں کی زندگی کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے اور ادخلوا فی السلم کافۃ کا پیغام پیدا کرنے کے لئے عمل کرانے کے لئے حدود شرعیہ کو نافذ کرنے کے لئے قوانین شریعت کو رائج کرنے کے لئے جو پہلا خون ہندوستان میں صدیوں کے بعد ہی نہیں بلکہ عالم اسلام میں تھوڑے بہت مطالعہ کی بنا پر جس کا موقع مجھے مل سکا ہے یہ کہہ سکتا ہوں کہ عالم اسلام میں صدیوں کے بعد جو پہلا پاک خون۔ دم زکی۔ جس میں کوئی ملاوٹ نہیں تھی وہ خون جس سرزمین میں پہلی بار بہا ہے وہ آپ کی سرزمین ہے۔ یہ اکوڑہ خٹک کی زمین ہے۔ جس کے متعلق مرزا مظہر جان جاناں کا شعر صحیح ہوگا

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

یہاں جہاد رکھی گئی اس جہاد خالصاً لوجہ اللہ کی کہ جس کا رواج دنیا میں قریب قریب ختم ہو چکا تھا کسی بادشاہ کے متعلق کسی غازی کے متعلق کسی فاتح کے متعلق تاریخ نہیں لکھتا کہ جہاد شروع کرنے سے پہلے اس نے اعلان نامہ بھیجا ہو کسی حریف کو جس کے خلاف اس نے غزا کرنا تھا جہاد کرنا تھا کہ تین چیزیں ہیں، پہلی دعوت تمہاری یہ ہے کہ تم اسلام قبول کر لو اگر تم اسلام قبول کر لوگے تو ہم یہ زمین تمہارے حوالے کر جائیں گے تم ہمارے بھائی ہوگے پھر ہمیں کوئی حق نہیں ہوگا کہ بستی تمہاری جگہ بیٹھیں اس لیے کہ یہ آقاؤں کا تبادلہ نہیں یہ دین کا اور مسلک کا تبادلہ ہے، یہ اللہ کے ساتھ عہد و پیمان کرتے ہو تو اول ہو تم زیادہ حقدار اگر یہ تمہیں منظور نہیں تو تم جزیہ دینا منظور کر لو یا ہمارے بن جاؤ ہم تمہاری حفاظت بھی کریں گے اور تمہیں اپنے حال پر باقی رکھیں گے اگر یہ بھی منظور نہیں تو پھر لڑنے کے لئے تیار، تین چیزیں تھیں اور یہ بات اتنی پرانی ہو گئی تھی کہ فتوح البلدان بلاذری میں آتا ہے کہ جب سمرقند فتح ہوا تو وہاں کے لوگوں کو کسی طرح پتہ چل گیا کہ اصل ترتیب اسلام میں یہ ہے کہ سب سے پہلے اسلام کی دعوت دی جائے پھر اس کے بعد جزیہ کی پیشکش کی جائے گی اگر وہ بھی منظور نہ ہو تو پھر قتال ہے۔ تو انہوں نے دیکھا کہ سمرقند میں فوجیں داخل ہو گئیں بغیر دعوت اسلام دیے اور بغیر جزیہ کا مطالبہ کئے تو ان کو ایک عرصہ کے بعد ہوش آیا جب کہ مسلمان وہاں بس گئے تھے، وہاں گھر بنا لیے تھے۔ تو انہوں نے ایک وفد روانہ کیا، حضرت عمر بن عبد العزیز کی خدمت میں جنہیں خلفاء راشدین کی فہرست میں شامل کیا جائے وہ جنہیں خلیفہ خامس کہتے ہیں ان کو معلوم ہوا کہ وہ خلیفہ عادل ہیں اور شریعت پر پورا پورا عمل کرتے ہیں تو ایک وفد رتب ہو کر ان کے پاس حاضر ہوا اور ان سے شکایت کی کہ سمرقند بغیر اس سنت کے اور بغیر ایک حکم شرعی پر عمل کیے فتح ہو گیا ہے، انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک پرچہ لکھا وہاں کے قاضی کے نام کہ جس وقت تمہیں یہ پرچہ ملے تو اسی وقت عدالت کرو اور وہاں اس بات پر شہادت لو کہ جس وقت مسلمانوں کے قائد فوج کے قائد نے سمرقند فتح کیا، کیا اس وقت اس سنت پر عمل کیا گیا تھا یا نہیں۔ اگر ثابت ہو جائے کہ کوئی تمہید اس امر پر نہ ہو کہ پہلے اسلام اور پھر جزیہ کی دعوت دی گئی تھی تو تمام مسلمان فوجیں اسی وقت سمرقند چھوڑ کر اس کی حدود سے باہر جا کر کھڑی ہو جائیں اس کے بعد اس سنت پر عمل کریں پہلے اہل سمرقند کو اسلام کی دعوت دیں اگر منظور ہو تو فبہا نہ ہو تو پھر جزیہ کا پیش کریں اگر اسے بھی نہ مانیں تب جہاد کریں قاضی صاحب کو پرچہ ملا انہوں نے عدالت طلب کی مدعا علیہ مسلمانوں کی فوج کے قائد ہیں اور دنیا کی تاریخ میں شاید اس واقعہ کی نظیر ملے کہ ایک فاتح

جس نے اپنی نوک شمشیر سے اتنا اہم علاقہ ترکستان کا دار الخلافہ فتح کیا تھا وہ مدعی علیہ اور ایک معمولی مسلمان کی حیثیت سے حاضر تھا اس مسجد میں اس سے پوچھا گیا اس نے اعتراف کیا کہ ہاں مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ میں یلغار میں اور اسلامی فتوحات کے تسلسل میں اس اہم شرعی حکم پر عمل نہیں کر سکا اور جب یہ معاملہ ثابت ہوگیا تو قاضی صاحب نے حکم دیا کہ مسلمان اس شہر سے تخلیہ کریں۔ اسے خالی کریں مسلمانوں نے گھر بنالیے تھے کھیتیاں جوت لی تھیں، بہت سے لوگوں نے اسے اپنا شہر بنالیا تھا تو سب کچھ چھوڑ کر دامن جھاڑ کر چلے گئے باہر جا کر کھڑے ہوگئے جب وہاں کے بت پرستوں نے یا بدھ مذہب کے ماننے والوں نے مشرکوں نے یہ معاملہ دیکھا کہ شریعت کا اتنا احترام ہے ان کے دلوں میں اور عدل و انصاف کا اتنا لحاظ ہے کہ وہ اپنے قائد قوات پر کمانڈر انچیف پر بھی اسے نافذ کرتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ اب لڑائی کی ضرورت نہیں ہم خود مسلمان ہوتے ہیں۔ چنانچہ سمرقند سارے کا سارا مسلمان ہوگیا اس واقعہ کے ذریعہ تو میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ اس وقت بھی جہاد کی اس سنت پر عمل کس طرح چھوٹ جاتا تھا اور اس کے بعد تو معلوم نہیں تاریخ کا تعین تو مشکل ہے مگر اس کے بعد مسلمانوں کی فتوحات کی تاریخ میں ہم یہ نہیں دیکھ سکتے کہ اس سنت پر عمل کیا گیا ہو ہوا یہ کہ فوجیں بڑھتی چلی جاتی تھیں اور جو علاقے اور جو شہر ان کے راستے میں آتے اسے فتح کر کے آگے بڑھتے جاتے مگر اس اللہ کے بندے نے اس مرد مجاہد نے جس کا نام حضرت سید احمد شہید ہے اور ان کے ساتھی مولانا شاہ اسماعیل شہید جنہیں ان کا وزیر اعظم کہیے یا دست راست کہیے یا دست و بازو کہیے یا لشکر کے قاضی مفتی اور شیخ الاسلام کہیے، ان دونوں نے پہلی مرتبہ اس سنت پر عمل کیا اور یہیں سے وہ اعلان نامہ لاہور روانہ کیا گیا جو لفظ بلفظ کتابوں میں منقول ہے، تو یہی وہ سرزمین ہے جو ان مجاہدوں کے خون سے لالہ زار بنی۔

خون شہیداں ضائع نہیں ہوتا وہ ہزاروں باغ کھلاتا ہے اور اس کے نتیجے میں جیسے باغ پیدا ہوتے ہیں اسی طرح مدرسے بھی پیدا ہوتے ہیں، خانقاہیں بھی پیدا ہوتی ہیں، مسجدیں بھی معرض وجود پر آتی ہیں اور وہ زمین اللہ کی راہ میں وقف ہو جاتی ہے اس لیے کہ اس پر شہیدوں کا اور مجاہدوں کا خون بہا ہے۔ تو آپ کی اس سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں پر اللہ کی راہ میں اس جہاد کا آغاز ہوا اور [illegible] تے میں سنا رہا تھا کہ ہمارے رائے بریلی کے ایک خاں صاحب تھے۔ عبدالمجید خاں صاحب ان کا نام بھی اس فہرست میں شامل تھا جنہیں رات کو بھیجا جانا تھا اکوڑہ کے چھاپہ کے لیے، رات کو چھاپہ ڈالا تھا اور یہاں سے مجاہدین کی جو فوج دکھائی، ۶ کوس دس کوس کے فاصلے پر اور پھر رات ہی کو شبخون مار کر واپس ہونا تھا تو حضرت سید احمد شہید کے سامنے جب فہرست آئی تو ان کو معلوم تھا کہ عبدالمجید خاں صاحب بیمار ہیں اور کمزور ہیں تو ان کے نام کے سامنے نشان لگا دیا کہ ان کا نام نکال دیا جائے کہ یہ کوئی جہاد کا اختتام نہیں، آغاز ہے۔ پھر بہت سے مواقع آئیں گے ان کو جہاد کے۔ تو ان کو جب معلوم ہوا کہ میرا نام فہرست سے نکال دیا گیا ہے تو کوئی اور ہوتا تو اس موقع کو غنیمت سمجھ لیتا کہ چلیے سر پر آیا ایک خطرہ تو ٹل گیا کہ چند آدمی دس ہزار کی فوج پر چھاپہ ڈالنے جارہے ہیں راستہ کے نشیب و فراز سے ناواقف ہیں۔ تو پہلا تجربہ تھا، سوچیے کہ معلوم نہیں کیا صورت پیش آئے، تو وہ ایسے موقعہ کو غنیمت سمجھ لیتے کہ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی میرا نام امیر المومنین نے خود ہی کاٹ دیا اس سے زیادہ بہتر کیا بات ہوگی، لیکن ایسا نہیں بلکہ وہ خود دوڑتے ہوئے آئے اور شکایت کی میرا نام کیوں فہرست سے کاٹ دیا ہے، فرمایا بھئی تمہیں بخار آرہا ہے، میں سن رہا ہوں کہ تم بیمار اور کمزور ہو اور یہ بڑا سخت چھاپہ ہے، اس کے لیے جفاکش اور تنومند لوگوں کی ضرورت ہے تو انہوں نے کہا کہ حضرت آج جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد قائم ہو رہی ہے اور یہ پہلا موقع ہے، تو کیا میں اس بنیاد کے موقع سے محروم رہ جاؤں تو میرا نام للہ اس فہرست میں شامل کر دیجئے تو ان کا نام اس فہرست میں شامل کر لیا گیا اور اللہ نے ان کو قبول فرمایا اور وہ اس چھاپہ میں شہید ہوئے۔

تو یہ سارے واقعات اس سرزمین کے ہیں پھر یہاں سے دوسرا مقام شیدو میں ہوا جو آپ کے قریب ہے، اس کے بعد پھر ہوتے ہوتے ہنڈ وغیرہ میں معرکے ہوئے، جہاں گڑھی وغیرہ میں، ان سب ناموں سے مانوس ہوں، اس راستہ پر آج میں پہلی مرتبہ آیا ہوں اور اس سے قبل پشاور اور مردان کے راستہ آنا ہوا تھا جو آج سے ۳۴-۳۵ برس پہلے کا واقعہ ہے، جب دار العلوم حقانیہ نہیں تھا اور میں آیا اور گھوم پھر کر چلا گیا، کیا معلوم تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا اور میری عمر وفا کرے گی اور اللہ مجھے اس وقت تک زندہ رکھے گا کہ میں پھر دوبارہ یہاں آؤں گا اور اپنی آنکھوں سے اس دار العلوم کو دیکھوں گا جہاں ان شہیدوں کی نصرت یاد تازہ ہے بلکہ اپنا انتساب بھی ان کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ یہ نسبت گرامی ایسی ہے کہ انشاء اللہ یہ رنگ لائے گی یہ خون شہیداں رنگ لایا۔ یہ نسبت انشاء اللہ رنگ لائے گی۔ اس کا نام حقانیہ ہے، اس میں حقانیت انشاء اللہ قائم رہے گی، اور یہاں سے جو لوگ نکلیں گے وہ حقانیت کے علمبردار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ الحدیث اور شیخ العلماء حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ کی زندگی میں برکت عطا فرمائے، اور وہ اس مدرسہ کی کامیابیوں کو دیکھ کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ خوش ہوں اور اللہ تعالیٰ ان کے لگائے ہوئے اس باغ کو سرسبز و شاداب رکھے اور پھلتا پھولتا رکھے۔

یہاں اس سرزمین میں ایک ایسا مدرسہ ضرور ہونا چاہیے تھا جہاں قال اللہ اور قال الرسول کی آوازیں بلند ہوں۔ اس لئے کہ یہ اسی قال اللہ اور قال الرسول ہی کا نتیجہ تھا کہ کتنے اللہ کے بندے ہتھیلیوں پر سر رکھے ہزاروں میل سے ہندوستان سے کہاں کہاں سے یہاں آئے اور کہاں یہ میدان یہ قال اللہ اور قال الرسول ہی تھا جو ان کو اتنا دور کھینچ لایا اور جب تک قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں بلند ہوتی رہیں گی انشاء اللہ تعالیٰ اللہ کی رحمت برستی رہے گی۔

ہنوز آں ابر رحمت درفشاں ست
خم و خمخانہ با مہر و نشان ست

ابھی یہ خمخانہ خالی نہیں ہوا جاری ہے اور حافظ کے اس شعر پر میں ختم کرتا ہوں،

از صد سخن پیرم یک نکتہ مرا یاد ست
عالم نہ شود ویران تا میکدہ آباد ست

کہ اپنے مرشد کی سو باتوں میں سے ایک بات مجھے یاد رہ گئی ہے کہ عالم اس وقت تک ویران نہیں ہوگا جب تک کہ میکدہ قائم ہے، یعنی میکدۂ معرفت قائم ہے۔ قال اللہ اور قال الرسول کا مرکز قائم ہے، اس وقت تک عالم ویران نہیں ہوگا اور یہ حدیث میں آتا ہے کہ جب تک ایک بھی اللہ اللہ کرنے والا باقی باقی ہوگا، اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی آپ کو مبارک ہو یہ سرزمین بھی مبارک ہو کبھی کبھی ے

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

اور اس دار العلوم کی آپ قدر کریں اس کے اساتذہ اور اس کے علماء کی قدر کریں یہاں ذہین طالب علموں کو بھیجیں اس لئے کہ اب ضرورت ہے جیسا کہ مولانا سمیع الحق صاحب نے اشارہ کیا کہ مغربیت کے فتنے میں ذہین لوگ سامنے آئیں کہ جن کے اندر حوصلہ ہو ولولہ ہو، اچھے خاندانوں کے ہوں ان میں مجاہدوں کا خون ہو، شہیدوں کا خون ہو، امینوں کا خون ہو، وفاداروں کا خون ہو، وہ آئیں اور وہ لوگ علوم کتاب و سنت پڑھیں اور اس کے بعد اس سرزمین میں جو اس وقت ایک دوراہے پر کھڑی ہے اور یہاں اسلامی قانون کے نفاذ کے ارادے کئے جارہے ہیں اور مطالبے بھی کئے جارہے ہیں، وہ رہنمائی کریں۔

بس ان الفاظ کے میں ختم کرتا ہوں۔ میں نے یہاں آ کر کسی پر احسان نہیں کیا میرا کسی کے اوپر کوئی احسان نہیں بلکہ میں نے اپنے اوپر احسان کیا ہے۔ اور بلانے والوں نے مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر احسان کیا کہ یہ عزیز سرزمین ہم کو دوبارہ دکھلادی۔

جس مقصد کے لیے یہ زمین رنگین ہوئی تھی اللہ تعالیٰ اس مقصد کو دنیا میں عام کرے اور اسلام کا کلمہ بلند ہو۔ اسلام کو غلبہ حاصل ہو اور ہمارے گھروں میں ہمارے دفتروں میں ہمارے اداروں میں سب جگہ اسلام نافذ ہو۔

دعا کیجئے اللہ تعالیٰ فضل فرمائے اللھم انصر من نصر دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم واخذل من خذل دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور ہمارے سب دوستوں عزیزوں کو تمام روحانی جسمانی بیماریوں سے شفائے کلی عطا فرمائے صحت عطا فرمادے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص للہیت عطا فرمائے۔ ہمارے قلوب کو منور فرمادے ہمارے دماغوں کو روشن کردے ہمارا اعضاء و جوارح کو قوت عطا فرمادے ہماری آئندہ نسلوں میں اسلام کو قائم رکھے۔ آمین

قارئین تعمیر حیات سے: اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے بعض ضروری مضامین کی اشاعت کی وجہ سے زیر نظر شمارہ میں "پاکستان کا سفرنامہ"، اور "دس دن پانچ دریاؤں کی سرزمین میں"، شائع نہیں ہوسکا —— ۱۰ر نومبر کے شمارہ سے "تعمیر حیات" کی ۱۶ ویں جلد کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس شمارہ سے عام شمارہ ۱۶ صفحات اور سالانہ ۲۰ روپئے زرمبادلہ کے سلسلے میں جلد اپنی رائے دیں۔ زیر نظر شمارہ دو شماروں پر مشتمل ہے، صفحات ۲۴، قیمت: ایک روپیہ کتابت و طباعت کی بعض فنی دشواریوں کی بنا پر مشترک شمارہ کی اشاعت پر ہم معذرت خواہ ہیں۔
(مدیر)

اسلامک اسٹڈیز کانفرنس منعقدہ اعظم گڈھ کی یاد

از — ابوعلی

محترمی سلام مسنون!

علی گڑھ کی اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا آٹھواں اجلاس اسی سال ۷ تا ۸ اکتوبر [illegible] ندوہ میں منعقد ہو رہا ہے۔ اس تقریب سے اس کے پچھلے اجلاس منعقدہ دار المصنفین سے متعلق یہ چند سطور بطور تاثرات کے پیش خدمت ہیں۔ امید ہے کہ تعمیر حیات کے کسی نمبر میں جگہ دے کر ممنون فرمائیں گے۔

آپ کا ابوعلی

آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کی بنیاد مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے سابق صدر اور اس کے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالعلیم نے علی گڑھ میں رکھی تھی، جس کا اجلاس ہر دو برس کے بعد کسی نہ کسی مرکزی اور تعلیمی شہر میں ہونا قرار پایا تھا۔ چنانچہ اس کا پہلا، دوسرا اور تیسرا اجلاس دو دو برس کے وقفہ کے بعد علی گڑھ ہی میں ہوا۔ علی گڑھ کے ایک اجلاس میں دار المصنفین کی نمائندگی اس کے سینیئر رفیق مولانا مجیب اللہ ندوی نے کی تھی، اور ایک مقالہ پڑھا تھا، اور دار العلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے نمائندگی وہیں کے ایک ذہین طالب علم مولانا شبیر عطا ندوی نے کی تھی اور مشہور مورخ، جغرافیہ داں اور سیاح مسعودی پر مقالہ پڑھا تھا، وہ اسی کے بعد دار المصنفین کی رفاقت میں آگئے تھے، یہیں انہوں نے اپنے اس مقالہ پر، نظر ثانی کی، لیکن ان کی طبیعت یہاں لگی نہیں اور چند ہی مہینوں کے بعد واپس چلے گئے، ان کا یہ مقالہ ان کے یہاں سے چلے جانے کے بعد معارف ۱۹۶۲ء میں باقساط تین نمبروں میں شائع ہوا جس کو اہل علم نے بہت پسند کیا۔ یہ مقالہ اتنا پر مغز، پر از معلومات اور مکمل تھا۔ بعد میں شاہ معین الدین احمد صاحب کو یہاں سے ان کے چلے جانے کے بعد بے حد افسوس ہوا۔ فرماتے تھے کہ ایک بہت ہی باصلاحیت آدمی جو بہت اچھا مصنف ہو سکتا تھا، ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ بڑے ہی ذہین اور قوی الحافظہ تھے۔ وہ کسی کتاب کا بھی ایک صفحہ پڑھ کر فوراً فر فر زبانی سنادیتے تھے۔ اس کا تجربہ میں نے بھی ایک دفعہ کیا تھا۔ وہ کسی عربی ادب کی کسی کتاب کا بہت ہی غائر نظر سے مطالعہ کر رہے تھے، میں نے کہا کہ آج میں آپ کے حافظہ کا امتحان لوں گا، فرمایا بہت خوب، اور کتاب میرے ہاتھ میں دے دی۔ اور کہا کہ اس کا کوئی بھی صفحہ کھول کر مجھے تھوڑی دیر کے لیے دیدیجیے، کتاب اچھی خاصی ضخیم تھی۔ میں نے ایک صفحہ کھول کر ان کے سامنے پیش کر دیا، انہوں نے اس پر ایک نظر ڈالی، اور پھر مجھے کتاب دیدی، اور کہا کہ اب زبانی سنئے، انہوں نے ایک ایک حرف اس کا فر فر سنادیا میں ان کی یہ کرامت دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اور ان کی قدر میرے دل میں بہت بڑھ گئی۔ معلوم نہیں اس معہد علمی سے نکل کر کہاں گئے، اور اب کس حال میں ہیں، ندوہ کے ۸۵ سالہ جشن میں بھی وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئے، اور نہ بدقسمتی سے مجھے ان کی یاد ہی آئی کہ میں ان کو تلاش کرتا۔ کم از کم مجھ کو ان کی بہت یاد آتی ہے۔

اس کانفرنس کا چوتھا اجلاس حیدرآباد میں ہوا، اور پانچواں اجلاس جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں۔ اس کے یہ تمام اجلاس بہت کامیاب رہے۔ اور اس کو اسلامیات کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے بہت مفید اور کارآمد سمجھا گیا۔ لیکن ان اجلاسوں میں سے کسی اجلاس کی بھی روداد مکمل طور پر اب تک لکھی نہیں گئی ہے، جو ایک قابل افسوس بات ہے۔ اس کا چھٹا اجلاس دار المصنفین کی دعوت پر شہر اعظم گڈھ میں ۳۰، ۳۱ دسمبر ۱۹۶۹ء میں ہوا۔ اس کے صدر ہمدرد دواخانہ دہلی کے مالک حکیم عبدالحمید صاحب تھے۔ اس کی مختلف نشستوں میں اسلامیات کے علماء، اساتذہ اور ریسرچ اسکالروں نے مختلف موضوع پر مقالے پڑھے، جو بہت دلچسپی اور شوق سے سنے گئے، بعض بعض مقالات پر مباحثہ بھی ہوا۔ ان نشستوں میں اچھی خاصی گیدرنگ ہوتی تھی اور پورا ہال بھر جاتا تھا۔ اس اجلاس میں راس کماری سے پنجاب تک کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے مشرقیات کے اساتذہ کھینچ کر آگئے تھے، جن کے لئے اس چھوٹے سے شہر میں سوائے دار المصنفین کے کوئی کشش نہیں تھی، نہ ان کے دیکھنے کے لیے یہاں مسلمان حکمرانوں کے دور کی سرے سے کوئی یادگار تھی۔ پھر بھی ایک بہت بڑی تعداد جمع ہوگئی تھی۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لئے اپنی عمر میں پہلی بار دار المصنفین کے سابق صدر مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے صاحبزادہ والا نواب عبیدالرحمن خاں شروانی سابق ٹریژرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھی دار المصنفین تشریف لائے تھے۔ اور ایک ہزار روپیہ اپنی جیب خاص اس ادارہ کو مرحمت فرمایا تھا، وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے اور ان کے اعزاز میں اس سلسلہ میں کئی تقریبیں ہوئیں۔

اجلاس دار المصنفین کے کئی برس کے وقفہ کے بعد اس کا ساتواں اجلاس مولانا عمران خاں ندوی ازہری کی دعوت پر بھوپال میں وہاں کی مشہور جامع شاہجہانی تاج المساجد میں ہوا تھا، اس کا افتتاح بھی مولانا علی میاں نے اپنی زبانی تقریر سے کیا۔ اور خطبہ استقبالیہ مولانا محمد عمران خاں نے پڑھا،

اس کے آٹھویں اجلاس کے لیے دار العلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے دعوت اعظم گڈھ کے اجلاس کے موقع ہی پر مولانا علی میاں ندوی نے دیدی تھی، پہلے خیال تھا کہ ندوہ کا ۸۵ سالہ جشن جب منایا جائے گا تو اس موقع پر اس کانفرنس کے انعقاد کی بھی دعوت دیدی جائیگی لیکن جشن کے انتظامات اتنے وسیع ہوگئے اور اس کا دائرہ کار اتنا بڑھ گیا کہ اس کے انعقاد کا ارادہ ترک کر دیا گیا اور سوچا گیا کہ آئندہ کسی منتظم موقع پر دار العلوم ندوۃ العلماء میں کانفرنس کے انعقاد کے لیے دعوت دے دی جائے گی۔ اسی سال ۷ تا ۸ اکتوبر دار العلوم ندوۃ العلماء میں کئی سال کے وقفہ کے بعد اس کا اجلاس ہونے جا رہا ہے، جس کے لیے ہم جیسے خادمان علم و اہل علم شدت کے ساتھ منتظر ہیں، امید ہے کہ اس میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کے شیوخ مشرقیات کے اساتذہ اور دانشوروں کے ساتھ عربی کی تمام مرکزی درسگاہوں مثلاً خود دار العلوم ندوۃ العلماء، دار العلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، جامعہ سلفیہ بنارس، جامعہ اشرفیہ مبارکپور کے فضلاء و علماء بھی شریک ہوں گے اور مقالات پڑھیں گے۔

ذیل میں اس کے پچھلے اجلاس منعقدہ دار المصنفین سے متعلق اپنے کچھ تاثرات پیش کر رہے ہیں۔

کانفرنس میں ڈاکٹر جی۔ آر۔ ریڈر شعبہ تعلیم کشمیر یونیورسٹی جو کانفرنس کے انعقاد سے دو روز پہلے ہی آگئے تھے، اور آتے ہی فرمایا کہ میں دار المصنفین سے استفادہ کرنے کے لیے آیا ہوں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری جنہوں نے کہا کہ دار المصنفین دیکھنے کی بڑی تمنا تھی جو اتنے دنوں جا کر پوری ہوئی۔ افضل العلماء مولانا محمد یوسف کوکن عمری صدر شعبہ مشرقیات مدراس یونیورسٹی جو ابن تیمیہ جیسی ضخیم کتاب کے مصنف بھی ہیں، ڈاکٹر نذیر الحق بحری آبادی [illegible] شعبہ فارسی کلکتہ یونیورسٹی مسعود حسن صدر شعبہ عربی کلکتہ یونیورسٹی، ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے ایک کمسن اور ہونہار طالب علم عبدالعظیم اصلاحی نے اپنے مدرسہ کی طرف سے نمائندگی کی۔ انہوں نے میرے مشورہ سے علامہ ابن رشد کی فقہی حیثیت پر ایک پر مغز اور پر از معلومات مقالہ لکھ کر سنایا، جس کو عام طور سے پسند کیا گیا، اور اس کا ایک حصہ مولانا شاہ معین الدین احمد کی کی نظر ثانی اور اصلاح کے بعد "معارف" میں بھی شائع ہوا، جس کا اس کمسنی میں بہت بڑا کارنامہ سمجھا گیا، ابن رشد تو اصلاً فلسفی تھا، اور ایک فلسفی کی حیثیت ہی سے اس کو شہرت حاصل ہے اور وہ ارسطو کے فلسفہ کا سب سے بڑا شارح سمجھا جاتا ہے۔ لیکن وہ اپنے دور کا بہت بڑا فقیہ بھی تھا اور موحدین کی سلطنت میں پورے اندلس کا قاضی القضاۃ بھی ہوگیا تھا۔ اس کی فقہ پر کتاب بدایۃ المجتہد بہت زمانہ تک نایاب تھی اس کا تذکرہ مولانا شبلی نے بھی اپنے مضمون میں کیا ہے جو دو ہی نمبروں میں شائع ہو کر رہ گیا پھر مولانا اس کو مکمل نہ کر سکے) جس کو مصر والوں نے کھوج کر نکالا اور بہت عمدہ ٹائپ میں چھاپ کر شائع کیا، ہندوستان میں سب سے پہلے مولانا حمید الدین فراہی کی نظر حیدرآباد کے زمانۂ قیام میں اس پر پڑی، اور انہوں نے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے فقہ کے نصاب کے لیے پسند کیا اور اس کو قدیم فقہ کی امہات کتب مثلاً ہدایہ اولین و آخرین وغیرہ کی جگہ پر اس کو رکھ بھی دیا گیا، اور وہاں پڑھائی جانے بھی لگی۔ ان [illegible] اسی بے نظیر کتاب کے ذریعہ سے حاصل کیا تھا، کانفرنس میں مقالہ پڑھنے کے لیے یہی موضوع [illegible]